www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

ستمبر 2021

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اُردو آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 9 ستمبر 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم بحکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64
■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL)
اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	دکن کی مایہ ناز محقق ڈاکٹر ثمینہ شوکت	ڈاکٹر رؤف خیر	5
جہانِ نسواں	نواب شاہ جہاں بیگم: بھوپال کی نامور خاتون حکمراں	ڈاکٹر نکہت فاطمہ	10
	منٹو کے افسانوں میں تانیثی عناصر	ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ	14
	قرۃ العین حیدر: اپنی تخلیق کے آئینے میں	ڈاکٹر محمد شارب	18
	لکھنوی تہذیب اور مسرور جہاں کے افسانے	شائستہ عالم	25
	ہندوستانی معاشرے میں 'عورت سے' منسوب محاورات اور کہاوتیں	فردوس انجم شیخ آصف	28
	شہزادی کلثوم: راجستھان کی ایک معصوم شاعرہ	مسرت پروین	31
	خواتین فرہنگ نویس کی فرہنگوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ	شاذیہ زریں	34
شناخت	گورکھپور میں اردو ادب کا درخشاں ستارہ ڈاکٹر درخشاں تاجور	بشریٰ صدیقی	40
نکہتِ سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		43
افسانہ	امیدوں کا موسم	صائمہ انصاری	44
ڈراما	صحرا سے نخلستان تک	ڈاکٹر شہناز صبیح	47
حسنِ سخن	شمشاد بیگم سنبل، ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، ذکیہ شیخ مینا		50
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		52
صحت	قوت بخش اور لذت سے بھرپور غذا	محمد طاہر صدیقی	54
آرائش وزیبائش			57
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

مشعل

معاشرے کی تشکیل اور ملک کی تعمیر میں اساتذہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کسی بھی قوم کا مستقبل اس کے تعلیمی نظام پر منحصر ہوتا ہے۔ تعلیمی نظام جتنا موثر ہوگا اس کا اتنا ہی اثر ہمارے معاشرے پر ہوگا۔ اساتذہ قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی فراہمی اور ان کی کردار سازی میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں اور کسی بھی قوم کے لیے ان بچوں کا مستقبل تابناک بنانا اساتذہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اساتذہ نئی نسل کو ترغیب دینے کا اہم فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔ اپنی دانشوارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قوم کے بچوں کا مستقبل سنوارتے ہیں۔ استاد کی اہم ذمہ داری طلبہ کی بدلتی سماجی ضرورتوں پر غور کرنا اور تدریس کے عمل میں ہونے والے تعلیمی تجربات اور ترقی کو ذہن میں رکھنا ہے۔ استاد اپنی شخصیت سے طلبہ کو متاثر کرتے ہیں اور ان کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کووڈ کا سب سے زیادہ منفی اثر جس شعبہ پر پڑا ہے وہ تدریس کا شعبہ ہے۔ ڈیجیٹل تکنیک کے سہارے اساتذہ طلبہ تک رسائی حاصل کر رہے ہیں۔ آڈیو اور ویڈیو کے ذریعے تدریس کا عمل جاری ہے۔ نئی تکنیک کے ذریعے اساتذہ تعلیمی عمل کو بہتر بنانے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ اساتذہ کو بہت سے چیلنجز درپیش ہیں، کیونکہ انھیں بچوں کو پڑھانے کی جگہ نئی حکمت عملی کے ساتھ بچوں کے لیے متبادل طریقے اپنانے ہیں۔ رسمی طریقوں کی بجائے جدید ٹکنالوجی کا سہارا لینا ہے۔ ابتدا میں صورت حال کافی پریشان کن تھی لیکن آہستہ آہستہ اساتذہ نے ان تمام رکاوٹوں کو دور کیا اور تدریس کے پرانے طریقوں کے بجائے جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ ہو کر منظّم طریقے سے بچوں کی تعلیم کی سمت میں آگے بڑھے۔ طلباء اور اساتذہ نے ڈیجیٹل ایپ سے بھی مدد لی۔ دنیا جیسے جیسے ترقی کر رہی ہے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ایک نئی دنیا کی تعمیر کر رہے ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے تعلیم کے شعبے میں بھی اپنی کارکردگی کا مظاہر کیا ہے اور یہ سفر ہنوز جاری ہے۔ جس برق رفتاری کے ساتھ انٹرنیٹ شعبۂ تعلیم میں اپنا اثر قائم کر رہا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں اسے اس سمت میں مزید کامیابی ملے گی۔

آن لائن تدریس کے تعلق سے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بھلے ہی یہ کلاس روم کا متبادل نہ ہو لیکن اس نے تدریس کے لیے ایک نیا دریچہ وا کیا ہے۔ آن لائن تدریس آج وقت کا تقاضہ ہے لہٰذا اس بات پر غور کیا جانا چاہیے کہ آن لائن تدریس کے دوران جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسے ایپ تیار کیے جائیں جن کے ذریعے تدریس کے فن کو آسان بنایا جاسکے۔ آن لائن تدریس کے دوران اس بات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جائے کہ طلباء اساتذہ کے رابطے میں رہیں، جس طرح آف لائن تدریس کے دوران اساتذہ طلباء پر بھرپور توجہ رکھتے ہیں، اسی طرح آن لائن تدریس کے دوران رکھیں۔ مثلاً یہ کہ اگر طلباء ادھر ادھر دیکھ رہے ہوں تو انھیں ایسا کرنے سے منع کریں اور انھیں ہدایت کریں کہ وہ دوران تدریس اپنا ذہن پوری طرح اساتذہ کی جانب مرکوز رکھیں۔ اگر اساتذہ اپنے طلبا سے دوران تدریس پوری طرح جڑ جائیں اور طلباء بھی اپنی تمام تر توجہ اپنے اساتذہ کی باتوں پر مرکوز رکھیں تو آن لائن تدریس اسی طرح مفید و موثر ثابت ہوگی جس طرح آف لائن تدریس ہوتی ہے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر رؤف خیر

دکن کی مایہ ناز محقق

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

تاریخ شاہد ہے کہ کئی شخصیتیں پسِ پردہ رہ کر کارنامے انجام دیتی رہی ہیں۔ نظام سادس میر محبوب علی خان نہایت کم سنی میں تخت پر بٹھائے گئے تھے اور امور سلطنت سالار جنگ اول بہ حیثیت مختار الملک انجام دیا کرتے تھے۔ نظام سادس کے ہوش سنبھالنے کے باوجود ان کی رہنمائی سالار جنگ ہی فرمایا کرتے تھے کہ وہ ایک تجربہ کار سیاسی مدبر تھے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔

چندولعل بھی ایسی ہی ایک سیاّس شخصیت کا نام ہے۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے انہی کی خودنوشت سوانح ''عشرت کدۂ آفاق'' کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ فارسی سے جس کا اردو ترجمہ ''فرحت کدۂ آفاق'' کے نام سے راجا راجیشور راؤ نے کیا۔ یہ دونوں کتابیں حیدرآباد ہی میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ''عشرت کدۂ آفاق'' کا سنہ اشاعت 1234ھ متعین کیا ہے۔ اس کے علاوہ چندولعل کی زندگی پر روشنی ڈالنے والی کچھ اہم تاریخیں بھی ہیں جن کو کھنگال کر ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے حقائق برآمد کیے ہیں جیسے:

1۔ منشی فیض اللہ کی نایاب تاریخ ''خزانہء گوہر شاہوار'' مخطوطہ۔ مخزونہ کتب خانہء آصفیہ 1246ھ 1830 حیدرآباد۔

2۔ غلام حسین خان جوہر کی ''گلزارِ آصفیہ'' (1260ھ)

3۔ منشی قادر خان بیدری کی تاریخ آصف جاہی۔ 1268ھ (جو 1266ھ میں مکمل ہو چکی تھی)

4۔ غلام امام خان ترین کی تاریخ رشید الدین خانی۔ 1270ھ مطابق 1854

5۔ مانک راؤ وٹھل راؤ کی ''بستان آصفیہ''

6۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری کی ''محبوب الزمن''

7۔ تذکرۂ شعرائے دکن از سید مراد علی طالع

8۔ میر منشی التفات حسین کی مرتبہ تاریخ نگارستان آصفی سنہ تصنیف 1231ھ مطابق 1815

9۔ راجا مکھن لعل کی ''تاریخ یادگار مکھن لعل'' 1242ھ جو چندولعل کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔

آیئے ''چندولعل شاداں'' پر دادِ تحقیق دینے والی معتبر و مستند و ثقہ ہستی ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے بارے میں پہلے جاننے کی کوشش کریں۔

پروفیسر ثمینہ شوکت 19 جون 1936 کو گلبرگہ میں پیدا ہوئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی میٹرک کی سند میں ان کا سالِ پیدائش 1934 درج ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم میٹرک تک گلبرگہ ہی میں ہوئی۔ انٹر میڈیٹ انھوں نے خانگی طور پر کامیاب کیا۔ 1952 میں بی۔ اے اور 1954 میں ایم۔ اے (اردو) عثمانیہ یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ 1960 میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ''مہاراجا چندو لعل حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر پروفیسر عبدالقادر سروری کے زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مذکورہ مقالے کے ممتحن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔ اس کے زبانی امتحان (viva) کے لیے پروفیسر گیان چند جین حیدرآباد تشریف لائے تھے۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا پی ایچ ڈی کا مذکورہ مقالہ دو حصوں میں شائع ہوا۔ پہلا حصہ ''مہاراجا چندو لعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی و سماجی پس منظر'' 1979 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس مقالے کا دوسرا حصہ ''مہاراجا چندو لعل شاداں۔ حیات اور کارنامے'' 1983 میں منظرِ عام پر آیا۔ جس وقت ڈاکٹر ثمینہ شوکت حیدرآباد یونیورسٹی میں ریڈر ہو کر شعبۂ اردو میں خدمات انجام دے رہی تھیں، اتفاق سے اسی زمانے میں پروفیسر گیان چند جین کا بھی حیدرآباد یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا تھا۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے اس مقالے کے پیش لفظ مورخہ 11/اپریل 1979 میں گیان چند جین نے بڑا اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف فرمایا:

''انھوں نے (ثمینہ شوکت) نے ''مثنوی لطف'' ترتیب دے کر شائع کی۔ میں اپنے ڈی لٹ کے مقالے ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' کو (کذا) اشاعت کے لیے انجمنِ ترقی اردو کو دے چکا تھا۔ مسودہ واپس لے کر میں نے اس میں ''مثنوی لطف'' کے تعارف کا اضافہ کیا۔ 1965 میں جب میں جموں اردو یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر مقرر ہوا وہاں ایم۔ اے کے نصاب میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا مرتبہ ''شکار نامۂ گیسو دراز'' شامل تھا۔ برسوں اُسے پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ حسن اتفاق ایسا ہوا کہ مارچ 1979 میں، میں نئی مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر ہو کر آ گیا۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا پہلے ہی یہاں تقرر ہو چکا تھا۔ اس طرح مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کی مسرت حاصل ہوئی۔'' (پیش لفظ)

پی ایچ ڈی کی تکمیل سے پہلے ہی عثمانیہ یونیورسٹی کے ویمنس کالج (کوٹھی) میں ثمینہ شوکت صاحبہ کا تقرر بہ حیثیت اردو لکچرر 1958 میں ہو چکا تھا۔ 1969 میں وہ ریڈر بن کر عثمانیہ یونیورسٹی منتقل ہو گئیں اور پھر 1979 میں چھے زائد تدریجی اضافوں Increments کے ساتھ بطور ریڈر اردو حیدرآباد یونیورسٹی میں تقرر عمل میں آیا جہاں 1984ء میں انھیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی اور وہ صدرِ شعبہ بن گئیں۔ 1994ء میں وہ وظیفہ حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوئیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ رہنے کے لیے وہ ٹورنٹو کینیڈا منتقل ہو گئیں۔

18/فروری 1965ء کو ثمینہ شوکت کی شادی جناب سکندر توفیق سے ہوئی جو گورنمنٹ پالی ٹکنک کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے اور اردو کے شاعر تھے۔ سکندر توفیق ڈرامے بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''کیا گھر نگر کیا خانقاہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

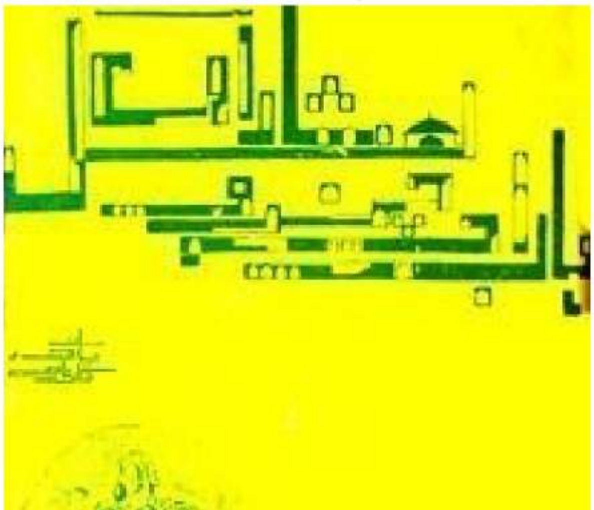

سکندر توفیق نے دکن کالج پونے سے صوتیات Phonetics میں ڈپلوما بھی کیا تھا۔ ''اردو کی ترسیلی لسانیات'' میں وہ اپنی شریکِ حیات ثمینہ شوکت کے شریک مصنف (co-writer) بھی رہے۔

سکندر توفیق خلاقانہ تجربے بھی کیا کرتے تھے چنانچہ انھوں نے سات مصرعوں کی نظم کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام ''سباعی'' رکھا تھا۔ اس کے موجد و خاتم وہی ثابت ہوئے۔ یہ اختراعی ''سباعی'' ناکام تجربہ ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنے تحقیقی مقالے ''مہاراجا چندو لعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی و سماجی پس منظر'' کا انتساب اس طرح کیا

ہے۔

''سکندر توفیق کے نام جو میرے رفیق زندگی ہی نہیں رفیقِ قلب و ذہن بھی ہیں''۔ ثمینہ شوکت جون1979ڈاکٹر حبیب نثار کی اطلاع کے مطابق پروفیسر ثمینہ شوکت کا انتقال ٹورنٹو کینیڈا میں2016 میں ہوا۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تحقیق کا ایک شاہ کار ''شکارنامہ'' ہے جو گلبرگہ کے حضرت خواجہ گیسو دراز کے اہم اردو رسالوں میں شامل ہے اور جو کئی مخطوطات کے متن کو سامنے رکھ کر 1962 میں مرتب کیا گیا تھا جس کے بارے میں گیان چند جین نے کہا کہ یہ جموں یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہونے کی وجہ سے وہ اسے اپنے طلبہ کو پڑھاتے رہے ہیں جب وہ جموں میں اردو کے استاد تھے۔

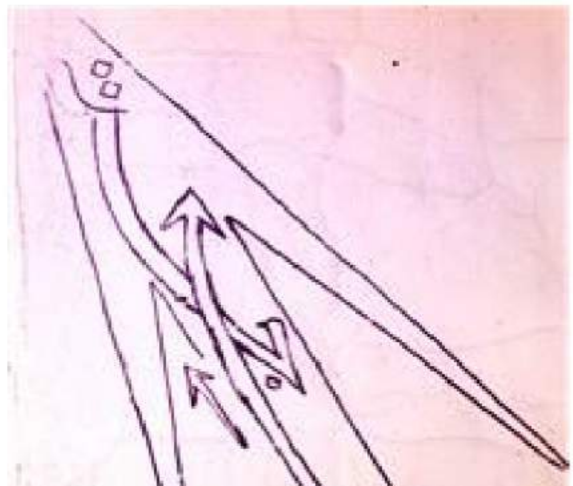

1959 ہی میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ممکنہ مآخذ کے حوالوں سے مہ لقا بائی چندا کو اردو کی اولین صاحبِ دیوان شاعرہ ثابت کیا تھا۔ مہ لقا بائی ایک حسین طوائف تھیں اور چندولعل کی بھی منظورِ نظر تھیں۔ چندولعل ان پر کافی مہربان تھے۔ دونوں کے مابین کافی بے تکلفی بھی تھی۔ درگا پرشاد نادر نے ''تذکرۃ النساء'' میں ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے ان دونوں کے ''تعلقات'' پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ایک روز راجہ (چندولعل شاداں) صاحب نے صبح کے وقت اس (مہ لقا) کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

ہے چین کہاں جب سے مری آنکھ لڑی ہے
ملنے کی نجومی تو بتا کون گھڑی ہے

اس شوخ دیدہ و ذہن دریدہ حاضر جواب نے فوراً یہ شعر فی البدیہہ موزوں کر کے سنایا:

پہلے ہی سے چلاّ کے مرے دل کو ستامت
اے مرغِ سحر چپ رہ ابھی رات بڑی ہے

اس سخن گسترانہ انداز سے اس طوائف کی بے باکی اور بے تکلفی ظاہر ہوتی ہے۔

959 تک مہ لقا بائی چندا ہی کے سر اولین صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کا سہرا باندھا جاتا رہا ہے۔ بعد کی تحقیق میں اسد علی خان تمناؔ کی بیگم لطف النساء پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ قرار پائیں۔ لطف النساء امتیاز نے اپنے دیوان کے آخر میں اس کے ترتیب پانے کی تاریخ بھی خود موزوں کی ہے۔

چوں از کنیز حضرتِ خاتون دریں زماں
اشعارِ تازہ جمع تہہ دل شگفتہ شد
از روئے ''یمن'' سالِ ہمایون ایں کتاب
''دیوانِ امتیاز بخوانید'' گفتہ شد

''دیوانِ امتیاز بخوانید'' کے اعداد1203 ہوتے ہیں ان میں روئے یمن یعنی (ی) کے دس عدد جمع کر لیں تو1213ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس طرح امتیاز کا دیوان1213ھ میں اور مہ لقا بائی چندا کا دیوان اس کے ایک سال بعد1214ھ میں منظرِ عام پر آیا تھا۔

(ملاحظہ ہو عہد ارسطو جاہ۔علمی ادبی خدمات از ڈاکٹر لئیق صلاح سنہ اشاعت جنوری1986ء نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد)

1962 ہی میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ''مثنوی لطف'' اور ''حیات لطف'' دو کارنامے انجام دیے جن کی اہمیت کا اندازہ پروفیسر گیان چند جین کے اس اعلیٰ ظرفی کے مظاہرے سے ہوتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تحقیق ''مثنوی لطف'' کو اپنے چھپنے والے ڈی لٹ کے مقالے ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' کا حصہ بنالیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تحقیقی کتاب ''حیات لطف'' بھی آئی جس میں مرزا علی لطف کے کوائف اور ان کے فکر وفن کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بڑی عرق ریزی سے تلاش کر کے لطف کی مثنوی اور مخطوطہ دیوان کے

ساتھ ساتھ ممکنہ مآخذ سے لطف کا کلام اخذ کر کے لطف کے حیات اور کارناموں پر سیر حاصل مقدمے کے ساتھ کلیاتِ لطف بھی 1962 میں مرتب کیا۔ 1962 میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ''دیوانِ لطف'' بھی مدون کیا جس میں مرزا علی لطف کی غزلیات، قصائد اور دیگر اصنافِ کلامِ لطف جمع کر کے کارنامہ انجام دیا۔

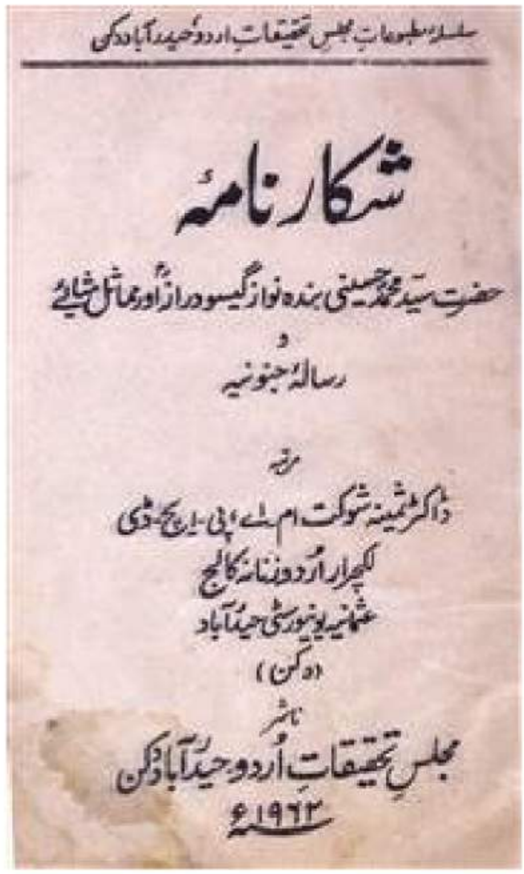

مرزا علی لطف کے فکر و فن پر ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی دادِ تحقیق میں ان کے استاد پروفیسر عبدالقادر سروری کے بے پایاں لطف کا یقیناً دخل ہے جس نے سدّ سکندری بھی پار کر لی تھی۔ چندو سے چندا تک یہ بے پایاں لطف بر قرار رہا ہے۔

مرزا علی لطف پر اتنا کچھ مواد حاصل ہونے کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ عثمانیہ یونیورسٹی سے مرزا اکبر علی بیگ نے ''مرزا علی لطف حیات اور کارنامے'' پر پی ایچ ڈی کر لی۔

مشاہیر نے ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی مرزا علی لطف پر دادِ تحقیق کی کھل کر داد دی اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے خط مورخہ 20/ستمبر 1962 میں فرمایا:

''آپ کی بھیجی ہوئی کتاب ''مثنوی لطف'' بہت پسند آئی اور آپ کی محنت کا اندازہ کر کے خوشی ہوئی۔

امید ہے کہ ہر ایک پڑھنے والے کو یہ کتاب پسند آئے گی۔ خدا آپ کو مبارک کرے۔ مخلص ذاکر حسین

پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی، ڈین شعبہء دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایڈیٹر ''برہان'' دہلی نے یوں تبصرہ فرمایا:

''مرزا علی لطف کا دیوان اور ان کی مثنویاں گوشہء گم نامی میں پڑی ہوئی تھیں اور ان کے حالات کا بھی کچھ ایسا علم نہیں تھا۔ محترمہ ثمینہ شوکت جنھوں نے لطف کے کلیات کو جس میں دیوان بھی ہے اور مثنوی بھی، بڑی محنت سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔''

ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ ایم۔اے، پی ایچ ڈی، ڈی لِٹ صدر شعبہء اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد فرماتے ہیں:

''مثنوی لطف کے لیے ادارۂ تحقیقات کا بہت ممنون ہوں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ذاتی طور پر ''لطف'' کیا ہے۔ انھیں تحقیقی کام کرنے کا بہت سلیقہ ہے (بلکہ سگھڑپن) معلوم ہوتا ہے۔ حالات اور متن کی تدوین بڑے اچھے انداز میں کی گئی ہے۔''

پروفیسر ہارون خان شروانی ایم ایل سی۔ سابق صدر شعبہء تاریخ و سیاست و (صدر دہلی کالج دہلی) کی رائے بھی سند کا درجہ رکھتی ہے۔

''لطف کے نام اور اس کی مثنوی سے، بہت کم لوگ آشنا تھے۔ فاضل مولفہ نے حیدرآباد کے دو اور علی گڑھ اور رام پور کے ایک ایک نسخے کا تن دہی سے مطالعہ کیا ہے اور ساتھ ہی کم و بیش ایک سو صفحے کی تمہید کے ذریعے اردو پریمیوں کو لطف اور ان کے زمانے کے ماحول سے دوچار کرنے کی کوشش کی ہے۔''

پروفیسر اے سی شرما، صدر شعبہء اردو و فارسی جبل پور یونیورسٹی فرماتے ہیں:

''مثنوی لطف'' موسوم بہ ''نیرنگِ عشق'' اردو ادب اور تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ جدید اضافے نے دیرینہ ادبی و تاریخی کمی کو پورا کیا ہے یہ ادبی قوتِ تخلیق اور ناقدانہ نگاہ پر شاہد ہے۔ میری رائے میں اس مثنوی کا درس گاہوں کے

نصاب میں شامل کرنا حق بجانب ہوگا۔ مجھے قوی امید ہے کہ
اس مستند نسخے کو اربابِ ذوق وشوق ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔''

محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت صاحبہ نے ''مہاراجا چندولعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی وسماجی پس منظر'' کے عنوان سے جو دادِ تحقیق دی ہے وہ بھی اپنی جگہ دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ان کی یہ معرکہ آرا کتاب 1979 میں اردو اکاڈمی آندھراپردیش (موجودہ تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈمی) اور ایچ ای ایچ دی نظامس ٹرسٹ حیدرآباد کے رقمی تعاون سے منظر عام پر آئی۔ سید منظور محی الدین کی کتابت کی مرہونِ منّت یہ کتاب نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد کے زیراہتمام لیتھو پر شائع ہوئی ہے۔ کاغذ بہت معمولی ہے اور اس تحقیقی کتاب کے شایانِ شان نہیں ہے۔ چھ سو صفحے پر مشتمل اس اہم کتاب کی قیمت صرف پینسٹھ روپے پچاس پیسے ہے۔

چندولعل شاداں کے تعلق سے اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر گیان چندجین نے بڑی بے باکی سے فرمایا:

''مصنفہ سے خائف ہوئے بغیر میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ چندولعل کوئی بڑے شاعر نہ تھے۔
ان کی بنیادی اہمیت ریاستی مدارالمہام کی ہے۔ ادب میں ہم انھیں شاعر سے زیادہ شاعروں کے مربی کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔''

اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہم پر روشن ہوا کہ چندولعل ''راجا'' تو نہیں تھے مگر بڑے سیاس اور بادشاہ گر تھے۔ چندولعل شاداں آصف جاہی سلطنت میں اس قدر دخیل تھے کہ جسے چاہے سرفراز کرنے کے جتن کرسکتے تھے اور جسے چاہے معتوب و بے دخل کردیا کرتے تھے۔ انگریز ذمہ داروں تک بھی ان کی رسائی تھی۔ انگریز بھی ان کے ذریعے اپنا کام نکال لیا کرتے تھے۔ انھیں آلہء کار بناتے تھے۔ چندولعل اور انگریز امدادِ باہمی پر عمل پیرا تھے۔ چندولعل دولتِ آصفیہ میں بظاہر پیش کار تھے مگر دراصل defacto مدارالمہام کے فرائض بھی وہ انجام دیا کرتے تھے۔ ناصرالدولہ کو بھی سریرآرائے سلطنت بنانے میں چندولعل نے اہم حصہ (کردار) ادا کیا نتیجتاً ناصرالدولہ ان کے احسان مند تھے اور ان کی ہر اعتبار سے قدر کیا کرتے تھے۔

چندولعل شاداں پر لکھتے ہوئے انھی کی خودنوشت ''عشرت کدۂ آفاق'' کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اصل ماخذ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی دیگر تاریخوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ''عشرت کدۂ آفاق'' چندولعل نے فارسی میں لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ راجا راجیشور راؤ نے کیا تھا۔ عشرت کدۂ آفاق کی تصنیف 1234ھ میں ہوئی۔ چندولعل نے خود اپنے تعارف میں کہا:

''ان کا وطنِ مالوف معروف آباد ہے۔ وہ قوم سے کھتری کے فرقہ مہرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔
ان کا سلسلہ اکبر بادشاہ کے نورتن راجا ٹوڈرمل سے ملتا ہے جو خود بھی کھتری قوم کے مہرہ شاخ سے وابستہ تھے۔...''

اس دور کی دیگر تاریخوں نے بھی اس پر صاد کیا۔ ظاہر ہے چندولعل کے اثر ورسوخ کے سبب بے چون و چرن تاریخی نسب مان لینے میں ہی عافیت تھی۔

میر محبوب علی بادشاہ نظام سادس کے ایما پر پیرانِ پیر کے خاندان کے ایک فرد سید عبدالرزاق کو حیدرآباد مدعو کیا گیا اور بادشاہ کے ساتھ ساتھ بیشتر درباری عبدالقادر جیلانیؒ کے سلسلے سے وابستہ ہوکر قادری ہوگئے تھے۔ تاریخی عمارت چار مینار میں پیرانِ پیر کا اولین چلہ قائم کیا گیا اور ہر سال گیارھویں کے موقع پر دفتر امور مذہبی کے زیراہتمام گیارہ دیگ بریانی چار مینار لاکر تقسیم کی جاتی تھی جسے غریب عوام اپنی بھوک مٹانے کے لیے اور خواص بہ طور تبرک حاصل کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو ''حیدرآباد کی خانقاہیں'' مطبوعہ 1994)

ماخذ:

1۔ مہاراجا چندولعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی وسماجی پس منظر۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا پی ایچ ڈی کا مقالہ، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چارکمان حیدرآباد۔ مطبوعہ 1979

2۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت حیات وخدمات۔ ڈاکٹر شفیق احمد کا پی ایچ ڈی کا مقالہ۔ جو کالج آف لنگویجس میں ڈاکٹر فاطمہ آصف کی زیرنگرانی لکھا گیا جس پر عثمانیہ یونیورسٹی نے شفیق احمد کو 2006 میں Ph.D کی ڈگری سے نوازا۔

3۔ عہدِ ارسطو جاہ۔ علمی وادبی خدمات۔ ڈاکٹر لئیق صلاح کا پی ایچ ڈی کا مقالہ، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد۔ مطبوعہ 1986

□□□

Dr. Raoof Khair

Moti Mahal Golconda Fort

Hyderabad-500008 (Telangana State)

cell : 9440945645

Email : raoofkhair@gmail.com

ڈاکٹر نکہت فاطمہ

نواب شاہ جہاں بیگم

بھوپال کی نامور خاتون حکمراں

ہندوستان کی ریاست بھوپال میں نواب شاہ جہاں بیگم ریاست بھوپال کی تیسری حکمران تھیں۔ ان کی پیدائش 6 جمادی الاول 1254ھ/ 30 جولائی 1838 کو قلعہ اسلام نگر، بھوپال میں ہوئی۔ ان کی والدہ نواب سکندر بیگم نے ان کی ہر قسم کی تربیت کا اہتمام کیا۔ خانہ داری کی تعلیم اپنے ذمہ لی اور کتابی و دینی تعلیم کے لیے اس زمانے کے ممتاز علما کو مقرر کیا۔ امور مملکت کی تعلیم کے لیے ریاست کے خاص اراکین مامور کیے گئے۔ اس کے علاوہ گھڑ سواری اور نشانہ بازی کی مشق کرائی گئی۔

دسمبر 1844 میں اپنے والد نواب جہانگیر محمد خان کے انتقال کے بعد شاہ جہاں بیگم کم عمری میں ریاست بھوپال کی حکمراں بنیں۔ مگر انتظام سلطنت ان کی والدہ نواب سکندر بیگم کے ہاتھ میں رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نواب سکندر بیگم کو بحیثیت نائب السلطنت مقرر کیا۔ شاہجہاں بیگم رسمی طور پر حکمراں رہیں۔ جب سن شعور کو پہنچیں تو کافی جستجو اور غور و خوض کے بعد بخشی باقی محمد خاں نصرت جنگ سپہ سالار ریاست بھوپال سے ۱۱ ذیقعدہ 1271ھ/ 26 جولائی 1855 میں ان کی شادی ہوئی۔ دو صاحبزادیاں نواب سلطان جہاں بیگم اور نواب سلیمان جہاں بیگم کی ولادت ہوئی۔ نواب سلیمان جہاں بیگم کا انتقال کم سنی میں ہی ہو گیا۔ شادی کے 12 سال بعد ان کے شوہر کا انتقال ہوا۔ پھر والدہ نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد شاہ جہاں بیگم باقاعدہ شعبان 1285ھ/ 16 نومبر 1868 کو ایوان موتی محل میں نواب شاہ جہاں بیگم کے نام سے تخت نشین ہوئیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر باقی محمد خان کا انتقال ہو چکا تھا، شوہر کے انتقال کے بعد بیوگی کی حالت میں ریاست کے تمام امور انجام دیتی رہیں۔ پھر اس وقت کے پولیٹیکل ایجینٹ اور کرنل رچرڈ ہیڈ کے مشورے پر دوسری شادی کرنے کے لیے آمادہ ہوئیں اور سید صدیق حسن خان کے ساتھ ۷ اصفر 1288ھ/ 8 مئی 1871 میں ان کی شادی ہوئی۔ نواب شاہ جہاں بیگم کی سفارش اور کوشش سے انگریزی سرکار نے صدیق حسن خان کو 'نواب والا جاہ امیر ملک' کا خطاب اور خلعت سے نوازا۔ نواب صدیق حسن خان بہت بڑے عالم اور کثیر التصانیف تھے۔ علما و فضلا کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان کی کوششوں سے بہت سی نایاب کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔

رفاحی اور اصلاحی کام:

نواب شاہ جہاں بیگم کو اپنی ولی عہدی کے زمانے سے ہی ریاستی

انتظام کے ہر کام کا تجربہ تھا اور ریاست کے تمام جزوی وکلی امور کا علم رکھتی تھیں۔ محنتی، ذہین اور علمی قابلیت کی حامل تھیں۔ انھوں نے کئی جدید اصلاحات کیں، جن کا ذکر انھوں نے 'تاج الاقبال' تاریخ بھوپال میں کیا ہے۔ وضع قوانین کا ایک محکمہ بنام 'تنظیمات شاہجہانی' قائم کیا۔ عدالتی اختیارات کی تقسیم کی گئی۔ امن وحفاظت عامہ سے متعلق وسیع انتظامات کیے۔ حفظان صحت سے متعلق امور پر خاص توجہ کی۔ ہر تحصیل میں طبیب مقرر کیا اور ان کے پاس ہر وقت دوائیاں موجود رکھے جانے کا انتظام کیا تاکہ فوری طور لوگوں کو طبی امداد مل سکے۔ ملازمت کے لیے مدارس کی تعلیمی سند لازمی کر دی گئی۔ شہر بھوپال میں His Royal Highness Prince of Wales کے نام سے ایک بڑا شفا خانہ بنوایا۔ ان ہی کے نام سے پرنس آف ویلز اسکول قائم کیا جس میں لڑکوں کو صنعتی کاموں مثلاً قالین بافی، چکن کاری، خیمہ دوزی، خیاطی، سونے چاندی کے کام وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ساتھ ہی ایک مدرسۂ نسواں بھی قائم کیا جس میں ہر قسم کا سونے چاندی کا گوٹہ، پٹھا، لیس، کلابتو، کامدانی، گوکھرو، زردوزی جیسے کام سکھائے جاتے تھے۔ غریب ونادار طلبا کے لیے لباس و خوراک کے علاوہ وظائف بھی دل کھول کر دیے جاتے تھے۔ عورتوں کے لیے مخصوص شفاخانہ 'لیڈی لنسڈن' کے نام سے قائم کیا جس میں دایہ گری کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا اور چیچک کے ٹیکے لگانے کی باقاعدہ شروعات کی۔ عوام کو ترغیب دی کہ بچوں کے یہ ٹیکے لگوائیں اور عوام کے اطمینان کی خاطر اپنی نواسی بلقیس جہاں بیگم کے ٹیکہ لگوایا۔ اس کے علاوہ جن بچوں کو ٹیکہ لگایا جاتا انہیں انعام بھی دیا جاتا۔ اپنی بیٹی نواب سلیمان جہان بیگم کی یاد میں ایک مدرسۂ سلیمانیہ بنوایا۔ اس مدرسہ کو بہت ترقی دی۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی کے الگ الگ سیکشن قائم کیے گئے۔ انگریزی تعلیم کے کلاس قائم کیے اسی کے ساتھ مدرسہ کے لیے ایک وسیع کتاب خانہ بھی بنوایا اور مدرسہ کو ترقی دے کر اسے کلکتہ یونورسٹی سے 1892 میں الحاق کرایا۔ اپنے والد کے نام پر مدرسۂ جہانگیری قائم کرایا جہاں صرف قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نواب بلقیس جہاں بیگم کی یاد میں لاوارث اور یتیم بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کے لیے 'مدرسۂ بلقیسی' بنوایا۔ اپنی والدہ کے نام سے اسٹیشن کے قریب ایک سرائے تعمیر کرائی۔ ڈاک بنگلوں کا قیام عمل میں آیا۔ غریب اور معذور لوگوں کی امداد کے لیے وظائف مقرر کیے گئے۔

عمارات:

مغل بادشاہ شاہ جہاں کی طرح نواب شاہ جہاں بیگم کو بھی عمارات بنوانے کا بے حد شوق تھا جس کا ثبوت بھوپال میں ان کی تعمیر کرائی گئی عمارات سے ملتا ہے۔ ان تعمیرات کا ذکر انھوں نے 'تاج الاقبال' تاریخ بھوپال میں تفصیل سے کیا ہے۔ محلات میں شاہ جہاں آباد میں اپنی رہائش کے لیے اور ضروریات کے تحت 'تاج محل'، 'عالی منزل' اور 'بے نظیر' نام سے محلات تعمیر کرائے۔ ان کی تکمیل کے لیے بے دریغ روپیہ صرف ہوا۔ تاج محل نواب شاہجہاں بیگم کا خاص محل تھا جس میں متعدد کمرے تھے۔ ہر کمرے کا رنگ مختلف تھا اور اسی رنگ کی مناسبت سے فرنیچر آراستہ کیا گیا تھا۔ اس محل میں ایک عمارت 'ساون بھادوں' کے نام سے تیار کرائی گئی تھی جو تفریح گاہ تھی۔ 'عالی منزل' سے باہر اپنی دلچسپی کے لیے ایک زنانہ بازار بنوایا تھا جس کا نام 'پروین بازار' رکھا۔ ان عمارات کے اطراف میں نواب منزل، بارہ محل، میر گنج، قیصر گنج، مغل پورہ، خواص پورہ و فیروز پورہ چند محلے آباد کیے۔ عام رعایا کو بھی مکانات بنانے کی ترغیب دی۔

شاہ جہاں بیگم نے مساجد کی تعمیر میں بھی بے حد دلچسپی لی۔ عظیم الشان مسجد 'تاج المساجد' کے نام سے تعمیر کرائی۔ یہ مسجد دہلی کی جامع مسجد کے طرز پر بنائی گئی۔ مذہبی امور کا ایک جدید محکمہ قائم کیا، جس کے تحت شہر کی مساجد کو پختہ کرایا گیا۔ ہر مسجد میں امام، مؤذن، جاروب کش مقرر کیا گیا۔ مسجد میں گرم پانی، روشنی کا مناسب انتظام کیا گیا۔ ماہ رمضان میں نماز تراویح کا اہتمام، حفاظ کو انعام اور ختم تراویح پر شیرینی اور کھانا تقسیم ہوتا اور تمام خرچ ریاست کی طرف سے کیا جاتا۔

حصول ثواب اور رد بلا کے لیے ایک ختم خانہ قائم کیا گیا۔ جس میں متعدد اشخاص صرف اس لیے ملازم رکھے کہ کچھ خاص اوقات پر قرآن پاک کی تلاوت کریں اور احادیث نبوی کا ورد دریں۔

نواب شاہ جہاں بیگم نے مختلف ریاستوں، شہروں کے سفر کیے اور نئے نئے تجربات حاصل کیے۔ 1876 میں دہلی تشریف لے گئیں جہاں لارڈ لٹن نے 'تاج ہند' کا تمغہ اور ایک نشان عطا کیا۔ 1900 میں کینسر کا مرض لاحق ہوا اور تقریباً ۱۱ ماہ اس مہلک بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد 28 صفر 1319ھ/16 جولائی 1901 کو 63 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

عادات واطوار:

شاہ جہاں بیگم کی طرز زندگی ہندوستان کی قدیم بیگمات کی طرح تھی مگر طبیعت میں سادگی تھی۔ خانہ داری، دستکاری اور ہنر سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کا حافظہ قوی، ذہن تیز اور سیکھنے کی لگن تھی۔ شعر وشاعری کی طرف بچپن سے ہی طبیعت مائل تھی۔ یہ شوق ان کو اپنے والد کی طرف سے ملا تھا۔ مذہبی امور اور فرائض کی سخت پابند تھیں۔

تصنیف وتالیف:

نواب شاہ جہاں بیگم نہ صرف ایک اچھی حکمراں بلکہ بیدار مغز قلم پرور، ہمہ صفت ادیبہ وشاعرہ کی حیثیت سے منفرد مقام کی حامل بھی تھیں۔ انھوں نے نثر ونظم، تاریخ ولغت جیسے متنوع موضوعات پر اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور علم وادب کی سرپرستی میں بھی غیر معمولی حصہ لیا۔ نواب امیر الملک والا جاہ سے شادی کرنے کے بعد تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوئیں۔

منثور تصانیف:

1۔ تاج الاقبال: تاج الاقبال یا تاریخ بھوپال مشہور کتاب ہے جو انھوں نے نواب صدیق حسن خان کی فرمائش پر لکھی۔ اس کتاب میں سردار دوست محمد خان، بانی ریاست بھوپال کے حالات سے لے کر شاہ جہاں بیگم کی حکومت کے ابتدائی 4 سال تک کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب 11 فرمانروایان بھوپال کی جن کا زمانہ حکومت 1160ھ سے شروع ہوتا ہے، ایک مکمل تاریخ ہے۔ اس میں 169 سال کے تمام حالات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ آخر میں چند ضمیمہ جات ہیں جن میں اپنے زمانے کے دفاتر ومحکمہ جات کی تفصیل، جاگیروں کے حالات، گوشوارہ مردم شماری، مساحت، شرح پرگنہ جات وقصبات کے حال، غلہ ومیوہ جات کی پیداوار، ریاست کے خیر خواہوں کا تذکرہ وغیرہ نہایت وضاحت کے ساتھ درج ہیں۔ خاتمہ کلام میں لکھتی ہیں کہ ہم نے 1281ھ تک کے حالات لکھ کر کتاب کو مکمل کیا ہے اور آئندہ کے لیے اس تاریخ کا چوتھا دفتر یا حصہ لکھنا ہمارے ذہن میں ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ یہ کتاب نواب صدیق حسن خان کی فرمائش پر نواب شاہ جہاں بیگم نے لکھی۔ کتاب کے آخر میں نواب صاحب نے خاتمہ لکھا ہے جس میں وہ تاج الاقبال کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مصنفہ نے واقعات جوں کے توں لکھے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں کہ یہ تاریخ اس لائق ہے کہ موجودہ اور دوسری ریاست کے حکمران اس کو اپنے لیے مشعل راہ اور دستور العمل سمجھیں اور رئیسہ بھوپال کی انتظامیہ، صفات وبندوبست سے عبرت حاصل کریں اور اپنے بگڑے کام کی تدابیر اس کتاب سے سیکھیں اور دیکھیں کہ اس چھوٹی سی کتاب میں کیسے کیسے نگرانی کے بڑے بڑے مطالب بیان کیے گئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ کتاب مختصر ہے لیکن اگر اسے نوجوان پڑھیں تو ان کو ملکداری کی عقل آئے گی اور بزرگ اس کو سمجھیں تو ان کی ہوشیاری میں مزید اضافہ ہوگا۔ تاج الاقبال کا اردو وانگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

2۔ تہذیب النسواں وترتیب الانسان: یہ کتاب امور خانہ داری کی تعلیم کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ اس میں عورتوں کے امراض، ادویہ، ولادت، گھٹی، عقیقہ، تقریبات، غذا ولباس، بیماری وعلاج، منت، نذر، توہمات، ادعیہ، گھر کی آرائش، زیورات، تعلیم، فنون، سپہ گیری، کھانا پکانا، کپڑا رنگنا، کپڑا سینا، ازدواج، حقوق الزوجین، طلاق وخلع، عدت، تیمارداری، تعزیت، موت، تجہیز وتکفین، سوگ، خیرات وغیرہ کا بہ حوالہ احادیث نہایت عمدگی کے ساتھ سلیس عبارت میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم 'حیات شاہجہانی' میں لکھتی ہیں کہ تمام پڑھی لکھی عورتیں اس کتاب کا مطالعہ کریں اور اسے اپنا دستور العمل بنائیں۔ اس کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ کئی بار شائع کرا کر تقسیم کی گئی۔

3۔ خزینۃ اللغات: اس کتاب میں ۶ زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی، ترکی کے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار الفاظ درج ہیں۔ پہلے اردو کے الفاظ حروف تہجی کے مطابق ایک خانہ میں اور پھر فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی، ترکی الفاظ علی الترتیب بالمقابل پانچ جدا جدا خانوں میں لکھے گئے ہیں۔ سنسکرت، انگریزی الفاظ فارسی خط میں تحریر ہونے کے علاوہ انھیں زبانوں کے رسم الخط میں بھی لکھے گئے ہیں تا کہ تلفظ میں آسانی ہو اور صحت بھی رہے۔

مطبع شاہجہانی:

نواب شاہ جہاں بیگم علم کی قدر داں تھیں اور علمی کاموں میں فراخ دلی کے ساتھ حصہ لیتی تھیں۔ اشاعت وتعلیم کی ترقی کے لیے انھوں نے پریس کو ترقی دی اور مخصوص مطبع بنام مطبع شاہجہانی تعلیمی کتابوں کے لیے مخصوص کرایا۔ اس مطبع میں 'عمدۃ الاخبار' بھی شائع ہوتا تھا جس میں سرکاری گزٹ اور انگریزی اخبارات سے خبروں کے علاوہ بھوپال کے حالات، علمی مضامین وغیرہ درج ہوتے تھے۔

اس مطبع میں کلام مجید نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ طبع کرایا جاتا تھا۔ ادب، عربی زبان، فقہ وغیرہ سے متعلق بھی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے مذہبی علوم کی اشاعت کی طرف خاصی توجہ دی۔ اولوالعزمی کے ساتھ نہایت نایاب کتابیں جو تقریباً مفقود ہو چکی تھیں مثلاً فتح البیان، تفسیر ابن کثیر، فتح الباری، نیل الاوطار، شرح صحیح بخاری، نزل الابرار وغیرہ شائع کرائیں۔ شمع انجمن، صبح گلشن، روز روشن، اختر تاباں، تذکرۃ الخواتین جیسے فارسی کے اہم تذکرے شائع ہوئے۔

شاعری:

چوں کہ ان کے والد نواب جہانگیر محمد خان صاحب بہادر کا شعری

ذوق اچھا تھا، وہ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے شاہ جہاں بیگم کی طبیعت میں بھی شاعری کا عنصر نمایاں تھا۔ اردو میں پہلے 'شیرین' پھر 'تاجور' تخلص اختیار کیا۔ دو مطبوعہ دیوان 'تاج الکلام' اور 'دیوان شیرین' شائع ہو چکے ہیں۔ 'حیات شاہجہانی' میں نواب سلطان بیگم رقمطراز ہیں:

"مجھے بہت شک ہے کہ ان دیوانوں میں کل غزلیں وغیرہ ان کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شاعرہ تھیں لیکن نہ ایسی فرصت تھی اور طبیعت کا یہ رنگ تھا کہ ایسے عامیانہ مذاق میں، جوان دیوانوں میں جا بجا پایا جاتا ہے، وہ شعر و سخن کہیں۔ ان کی تہذیب کا معیار نہایت اعلیٰ تھا۔ ان کے ہر فعل و قول میں کامل متانت بھری ہوئی تھی۔ وہ کوئی سوقیانہ بات کبھی منہ سے نہیں نکالتی تھیں۔ یہ صحیح اور بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بعض درباری لوگوں نے، جو رسوخ یافتہ تھے، ان کے نام سے ایسی غزلوں او راشعار کو متنزاد کر کے طبع کرایا اور سرکار عالیہ (شاہجہاں بیگم) اپنی خلقی مروت و چشم پوشی سے خاموشی اختیار کر لی یا ان کے ملاحظہ میں دیوان پیش نہ ہوئے۔"

(ص150)

منظوم تصانیف میں ایک مثنوی 'صدق البیان' ہے۔ اس مثنوی میں پہلے قدیم افلاک کی حالت، بروج کی اشکال، موسم کی تبدیلی کے اسباب جو اثرات بروج سے پیدا ہوتے ہیں، زمین کی ماہیت اور فصلوں کی پیداوار کا ذکر، ہندوستان کی زمین کی کیفیت، کھیل تماشے، میلے، مختلف تہوار جیسے دسہرہ، بسنت، دیوالی وغیرہ کا ذکر، بادشاہ تیمور اور راجہ پتھورا کی جنگ میں تیمور کی فتح یابی، اس کا جشن فتح، بابر، شاہجہاں کا ذکر، دہلی کی عمارات، جشن کے علاوہ اس مثنوی میں ہندوستان کی جغرافیائی اور طبعی حالات اور قدیم معاشرے کا بہت عمدہ ذکر کیا گیا ہے۔

نواب شاہ جہاں بیگم نے فارسی میں بھی شعر کہے۔ ان کے احوال اور اشعار تاج الاقبال اور مختلف تذکروں مثلاً اختر تاباں، تذکرۃ الخواتین، روز روشن، شمع انجمن، نگارستان سخن، صبح گلشن، زنان سخنور، ماہ درخشاں، طور کلیم وغیرہ میں ملتے ہیں۔ اردو کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

مہرباں ہوگا جو وہ رشک قمر آپ سے آپ
دیکھنا آئے گا بیشک مرے گھر آپ سے آپ

گرمجوشی نے جو اس مہر کی کی ہے تاثیر
خشک ہونے لگے ان دیدۂ تر آپ سے آپ

آتش عشق کو سینے میں چھپائیں کب تک
دل میں ہے سوز تو نکلیں گے شرر آپ سے آپ

اس سبب سے میں ان میں شمس و قمر دیکھتا ہوں
میرے گھر آتے ہیں وہ شام و سحر آپ سے آپ

اشک باقی نہ رہا ہجر میں روتے روتے
اب نکلتے ہیں مے لخت جگر آپ سے آپ

اختلاط آپ کا بڑھتا ہے رقیبوں سے مدام
دیکھو مر جائے نہ یاں کوئی بشر آپ سے آپ

شعر شیریں کی وہ بندش ہے کہ کٹتے ہیں عدو
کس کو ملتی ہے بھلا ایسی ظفر آپ سے آپ

منابع و مآخذ:

1۔ تاج الاقبال، تاریخ بھوپال، شاہجہاں بیگم، مطبع نظامی، کانپور، 1889
2۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2012
3۔ تذکرہ اختر تاباں، ابوالقاسم محتشم، مطبع شاہجہانی، بھوپال، 1299ھ
4۔ تذکرہ روز روشن، محمد مظفر گوپاموی، مطبع شاہجہانی، بھوپال، 1297ھ
5۔ تذکرہ شمع انجمن، سید محمد صدیق حسن خان، مطبع شاہجہانی، بھوپال، 1292ھ
6۔ تذکرہ صبح گلشن، سید محمد علی حسن، مطبع شاہجہانی، بھوپال، 1295ھ
7۔ تذکرہ طور کلیم، سید نور الحسن خان، ، مطبع مفید عام، آگرہ، 1298ھ
8۔ حیات شاہجہانی، نواب سلطان بیگم، مطبع مفید عام، آگرہ، 1916ء
9۔ زنان سخنور، علی اکبر مشیر سلیمی، مؤسسہ مبوعاتی عالی، تہران، 1335ھ

□□□

Dr. (Mrs.) Nikhat Fatema
Assistant Professor,
Dept. of Persian, MANUU
Lucknow Campus, 504/122
Near Shabab Market, Nadwa Road
Tagore Marg, Lucknow-226020 (U.P)
(M) 91-9565487502

ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ

منٹو کے افسانوں میں تانیثی عناصر

اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو اردو ادب کا ایک بڑا افسانہ نگار ہے۔اس نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں اردو ادب کو جن مسائل سے روشناس کرایا اس کی عکاسی شاید صدیوں تک ممکن نہیں ہو پاتی اگر منٹو اس میدان میں اپنا قدم نہ رکھتا۔حالانکہ وہ اردو ادب کا سب سے بدنام افسانہ نگار بھی تصور کیا جاتا ہے۔لیکن وہیں دوسری طرف وہ اپنے مخصوص اندازِ بیان کی وجہ سے بے مثال بھی ثابت ہوا۔منٹو کی نظروں کے سامنے جو حالات تھے،جن میں اس کی زندگی کی نشو ونما ہوئی، کہیں نہ کہیں وہ ایک انقلابی دور تھا، ہندوستان کی تحریک آزادی زوروں پر تھی اور اردو ادب کے نامور مصنفین اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لے رہے تھے۔منٹو کا ذہن بھی اس فضا میں الجھ کر رہ گیا۔لہٰذا جب منٹو نے تخلیق کی دنیا میں قدم رکھا تو وہ سارے واقعات اس کے ذہن میں ایک کولاج کی صورت میں موجود تھے۔اس لیے منٹو نے سماجی وسیاسی ،معاشی ومعاشرتی مسائل کے درمیان سے ایک ایسے پہلو کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جو ہمارے سماج میں آئے دن آتے رہتے ہیں۔لیکن ہمارا سماج اور ہمارے نظامی اقدار اسے اپنی ذمہ داری کے حصے سے پرے سمجھتے ہیں۔منٹو نے سماجی وسیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ عورتوں کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا محور بنایا۔عورتوں کی زندگی اس کے افسانوں میں اس قدر رچ بس گئی کہ پھر اسے عورتوں کا افسانہ نگار سمجھا جانے لگا۔ ڈاکٹر اطہر پرویز اپنی کتاب 'منٹو کے نمائندہ افسانے' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

''منٹو کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ حقیقتاً 'عورت' کا افسانہ نگار ہے۔عورتوں کے لیے منٹو کے دل میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔جیسا کہ عام خیال ہے منٹو عورت کے صرف جنسی پہلو کو دیکھتا ہے۔یہ منٹو کو نہ سمجھنے کی بنا پر ہے۔منٹو کی عورتیں ہی منٹو کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں۔وہ چاہے زینت ہو یا جانکی، موذیل ہو یا برمی عورت، ممی ہو یا نیلم۔۔اس کے نزدیک عورت کا سب سے مقدس لمحہ وہ ہوتا ہے جب اس کے اندر ماں کی ممتا جاگتی ہے اور یہیں ہمیں منٹو کا اصل روپ نظر آتا ہے۔شاردا نذیر سے بے تعلق رہتی ہے، اس سے چڑھتی ہے لیکن جس وقت نذیر اس کے اندر کی ماں کو چھوتا ہے تو عورت نذیر کو بھی پیار بھری نظر سے دیکھتی ہے۔جب اس بچے کو دیکھ کر نذیر کہتا ہے کہ اس بچے کی ماں تو میں ہوں تو وہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ ابھی اس عورت نے نذیر کو پیار کرنے کی وجہ سے زمین پر تین بار حقارت سے تھوکا تھا۔غصے میں غالباً گالیاں دینے والی تھی کہ اس کے بچے کی رونے کی آواز آئی اور شاردا ماں بن گئی اور جب نذیر پوچھتا ہے کہ آپ کہاں جا رہی ہیں تو وہ ماں بن کر کہتی ہے 'منی رو رہی ہے، دودھ کے لیۓ' .... یہ نذیر نہیں بلکہ منٹو کہہ رہا ہے کہ 'یہ دودھ ......

ماں بننا اچھا ہے۔مردوں کی کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔عورت کھاتی بھی ہے اور کھلاتی بھی ہے۔اپنے بچے کو پالنا کتنی شاندار چیز ہے۔یہ دودھ، یہ سفید آبِ حیات ہے۔"

(صفحہ نمبر23-24منٹو کے نمائندہ افسانے)

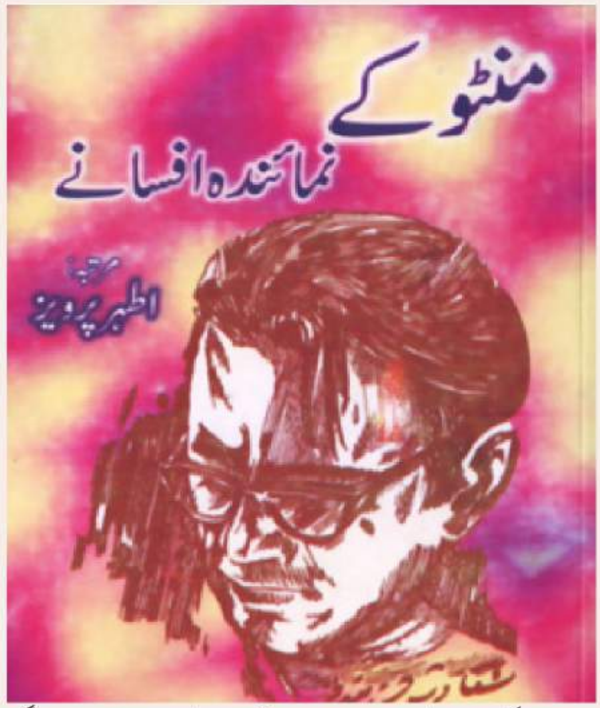

گرچہ منٹو کے افسانوں میں طوائفوں یا پھر سماجی وتہذیبی زندگی گزارنے والی گھریلوں عورتوں کی زندگی کی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے اس کے باوجود منٹو کا ثابقہ کبھی Feminism سے نہیں ہوا اور یہ بات وارث علوی نے اپنی کتاب 'منٹو: ایک مطالعہ' میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> "منٹو کے یہاں مظلوم عورتوں کی بپتا کی کہانیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔پھر وہ Feminist ادیب کبھی نہیں رہا۔بے شک اس کے یہاں زندگی کا المیہ احساس ہے اور مرد کے ہاتھوں عورت کی زبونی کا بھی لیکن وہ عورت اور مرد کو زندگی کے پیکار میں خیر وشر کی آمازگاہ کے طور پر دیکھتا ہے۔"

(صفحہ نمبر-81،منٹوایک مطالعہ)

لیکن آج جب ہم تانیثی ادب کی بات کرتے ہیں تو ان کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔منٹو کو تانیثیت کے حوالے سے سمجھنے سے پہلے ہمیں تانیثی ادب پر تھوڑی سی روشنی دالنے کی ضرورت ہے۔دراصل تانیثی ادب بھی دلت ادب کی طرح روایت سے بغاوت کی ایک تحریک ہے۔کیونکہ چند ایسے فرسودہ رسم ورواج ہمارے سماج میں موجود ہیں جن کی وجہ سے غیر برابری اور استحصال جیسے مسائل مسلسل ہمارے جمہوری نظام فکر کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔آج جب عورتیں تعلیم حاصل کر کے اونچے اونچے پائدان پر تخت نشین ہو رہی ہیں تو انھیں اپنی آزادی کا بھی احساس ہو رہا ہے اور اپنے وجود کا بھی۔آج وہ عورتوں کے وجود کو ایک ایسے چشمہ سے دیکھ رہی ہیں جہاں Patriarchy نظام فکر کے کسی سہارے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔آج ان کی اپنی پہچان ہے۔لوگ اپنے افکار بدلنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔لوگ ایک عورت کو اس کے والد یا بھائی یا شوہر یا بیٹے کے سبب نہیں بلکہ اس کے خود کے وجود اور ذاتی پہچان کے سبب بھی جانتے اور پہچانتے ہیں۔تانیثی ادب کا مرکز ومحور ایک عورت ہی ہے۔یہاں مرکزی کردار میں عورتیں نظر آتی ہیں۔منٹو تانیثی ادب کے اس اصول یا پیمانے سے واقف تھے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ عورتوں کا افسانہ نگار ہے۔منٹو صرف ایک افسانہ نگار ہے کسی تحریک کا بنیاد گزار نہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ Feminism سے کوسوں دور ہے۔لیکن منٹوں کی کہانیاں قاری کے ذہن پر ایک سوالیہ نشان ضرور قائم کرتی ہیں۔افسانہ 'سرمہ' کی کردار فہمیدہ اگر Patriarchy نظام کی قید سے باہر ہوتی تو شاید وہ موت کو گلے نہ لگاتی۔دوسری طرف افسانہ 'اولاد' کی زبیدہ اگر نسوانی حسّیت کی قید سے باہر ہوتی تو شاید وہ بھی اپنی زندگی کو اس طرح نہ مٹاتی۔

منٹو کے دونوں افسانوں 'سرمہ' اور 'اولاد' دونوں میں عورت کو مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ان دونوں افسانوں میں عورت اور ان کی عمر اور ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اہمیت کے حامل ہیں۔'فہمیدہ کی جب شادی ہوئی تو اس کی عمر انیس برس سے زیادہ نہ تھی۔'انہی الفاظ کے ساتھ افسانہ 'سرمہ' کا آغاز ہوتا ہے۔دراصل یہ وہ عمر ہے جو قانوناً لڑکیوں کو بالغ قرار دیتی ہے اور ہمارا سماج بھی اسے شادی کے لیے بہتر موقع سمجھتا ہے۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر کوئی لڑکی زیادہ عمر کی ہوگی تو اس کے خیالات بھی زیادہ پختہ ہوں گے۔پھر اس پہ حکم چلانا آسان کام نہ ہوگا۔اس لیے منٹو نے بھی اپنے اس افسانے میں محض انیس برس کی فہمیدہ کو ہی اپنے افسانے کا کردار بنایا ہے۔فہمیدہ جو بچپن سے ہی سرمہ کی بہت شوقین ہے اور جب اس کی شادی ہوتی ہے تو اپنی ماں سے باقاعدہ کہہ کر خاندانی چاندی کا سرمہ دان لے جاتی ہے۔شوہر سے پہلی ملاقات کی خوشی میں جب وہ تیار ہوتی ہے تو بڑے ہی

شوق کے ساتھ سرمہ بھی آنکھوں میں لگاتی ہے۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں شوہر کو فہمیدہ کی سرمہ دار آنکھیں پسند نہیں آتی ہیں اور بے ساختہ فہمیدہ سے پوچھتا ہے......

''تم اتنا سرمہ کیوں لگاتی ہو؟
فہمیدہ جھینپ گئی اور جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔
اس کے خاوند کو یہ ادا پسند آئی اور وہ اس سے لپٹ گیا لیکن
فہمیدہ کی سرمہ بھری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کالے کالے آنسو
بہنے لگے۔''

شوہر کے بارہا کوشش کے باوجود فہمیدہ نے کچھ نہیں کہا بلکہ ایک گلاس پانی مانگ کر اچھی طرح سے آنکھوں کو دھویا اور یہ بھی کہا کہ آج کے بعد کبھی سرمہ نہیں لگاؤں گی۔ جبکہ اس کے شوہر نے بارہا اسے سمجھایا کہ اسے فہمیدہ کا سرمہ لگانا برا نہیں لگتا وہ تو بس اتنا کہنا چاہ رہا تھا کہ کوئی بھی چیز ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے سے اس کی اصل خوبصورتی جاتی رہتی ہے۔ میاں کا ایک سوال فہمیدہ کے سامنے لاتعداد سوالات کھڑا کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اسے اپنے سماج کے نظام کے مطابق پتا تھا کہ اسے تو شوہر کا ہر حکم بجالانا ہے۔ فہمیدہ کو اچھی طرح پتا ہے کہ وہ صرف فہمیدہ نہیں ہے وہ کسی کی بیوی بھی ہے۔ فہمیدہ نے سرمہ نہ لگانے کا فیصلہ تو کر لیا لیکن وہ سرمے دانی اور سرمچو کو دیکھتی اور افسوس جتاتی کہ کیوں یہ دونوں اس کی زندگی سے جدا ہو گئے۔ پھر اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے......

''صرف اس لیے کہ اس کی شادی ہو گئی؟
صرف اس لیے کہ وہ کسی کی ملکیت ہو گئی ہے؟
یا ہو سکتا ہے کہ اس کی قوت ارادی سلب ہو گئی ہو۔''

طرح طرح کے سوالات ذہن میں آتے لیکن فہمیدہ اس کا ذکر کسی اور سے نہ کرتی لیکن سرمہ سے اس کا رشتہ کسی قدر کمزور نہیں پڑا۔ وقت گزرا، فہمیدہ کے گھر میں چاند جیسا بچہ آیا اور چالیس دن پورے ہوتے ہی فہمیدہ نے اس کی آنکھوں میں سرمہ لگایا اور راحت کی سانس لی۔ مانو اس کی صدیوں سے نامکمل خواہش پوری ہو گئی ہو۔ اس کا شوہر یہ سب دیکھ رہا تھا لیکن اس نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ فہمیدہ خوش رہنے لگی مانو اس کی سرمہ لگانے کی تمنّا اس کے بچے کی آنکھوں کے سہارے پوری ہو رہی تھی۔ آخر بچے کی برسی کا دن آیا اور فہمیدہ بڑے شوق کے ساتھ بچّے کا جنم دن منانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ دو دن پہلے ہی بچے کو ڈبل نمونیا ہو گیا جس کے سبب بچہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فہمیدہ کی خواہش اب مٹتی ہوئی معلوم ہونے لگی اور وہ پاگل سی ہو گئی۔ یہ پاگل پن اس کے بچّے کے مرنے سے کہیں زیادہ اس کی خواہش کے ادھورے پن کی وجہ سے تھا۔ فہمیدہ نے اپنے شوہر سے سرمہ کی خواہش ظاہر کی۔ سرمہ بازار سے لایا گیا، لیکن فہمیدہ کو شوہر کا لایا ہوا سرمہ پسند نہیں آیا نتیجاً وہ خود بازار جا کر سرمہ لے آئی۔ رات میں اس نے سرمے کو اپنی آنکھوں میں لگایا اور سو گئی۔ صبح میں اس کا شوہر جب اسے جگانے گیا تو دیکھا کہ فہمیدہ مر چکی تھی اور وہ بالکل ایسے سوئی تھی جیسے وہ اپنے بیٹے عاصم کے ساتھ سوتی تھی۔ اس کے پاس میں ایک گڑیا تھی جس کی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا۔

فہمیدہ کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال صرف فہمیدہ کے نہیں ہیں وہ ہر اس عورت کے سوال ہیں جو اپنے شوہر کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے کے سبب اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ وہ نہ تو خود کی زندگی جی پاتی ہے اور نہ ہی شوہر کے مطابق......۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب Feminism اردو ادب سے دور تھا تب بھی منٹوں نے اپنے کرداروں کے ذریعہ سماج کی برائیوں کی طرف اشارہ کیا۔ منٹوں نے جن افسانوں میں جنسی پہلو کو مرکز بنایا ہے ان میں بھی عورت کسی قدر گنہگار نظر نہیں آتی بلکہ قاری کو منٹو کے کرداروں سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ 'سرمہ' منٹو کے آخری دور کا افسانہ ہے۔ یہاں منٹو کا فن اور بھی پختہ نظر آتا ہے۔ اس دور میں منٹو عورت کے اندر چھپے ذاتی احساسات کو محسوس کرتا ہے، اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے جو یہاں ہم 'سرمہ' میں فہمیدہ کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

'اولاد' بھی منٹو کے آخری دور کا بہت کامیاب افسانہ ہے۔ اس افسانے میں 'زبیدہ' سماج کی ایک ایسی متوقع نتیجہ کا شکار ہو جاتی ہے جس پر اس کا کوئی زور نہیں تھا۔ ہمارے Patriarchy سماج میں ایک عورت کی پہچان اس کے باپ، بھائی، شوہر یا اولاد سے ہوتی ہے۔ اس کے اپنے وجود کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ زبیدہ کی شادی پچیس برس کی عمر میں ہوئی۔ دو سال گزرنے کے بعد بھی جب اس کے گھر میں بچوں کی کلکاریاں نہیں گونجی تو اس کی اپنی ماں سے لے کر دنیا والے تک سوال کرنے لگے۔ زبیدہ کی ماں کو اس بات کی فکر تھی کہ کاش کوئی بچہ ہوتا تو اپنی ساری رقم اور زیورات اس کو سونپ دیتی۔ ظاہری طور پر زبیدہ کے چہرے پر اپنی ماں کے ارادے کا کوئی اثر نہیں ہوا لیکن ذہنی طور پر اسے الجھن محسوس ہوئی اور اس کے دماغ میں بچہ نہ ہونے کا خیال زور پکڑنے لگا۔ وہ اپنے طور پر پوری کوشش کرنے لگی۔ لاکھ دعا اور دوا، پیروں فقیروں کے نسخے آزمائے گئے، لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر کار تنگ آ کر زبیدہ نے اپنی ماں سے کہا کہ......

''چھوڑ واس قصے کو...... بچہ نہیں ہوتا تو نہ ہو......

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا، 'بیٹا...... یہ بہت بڑا قصہ ہے...... تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے...... تم اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے...... اسی سے تو انسان کی زندگی کا باغ ہرا بھرا رہتا ہے۔''

زبیدہ کو حقیقت پتا ہے کہ اس نے تو کسی قدر کوشش میں کمی نہیں کی، سب کچھ تو کر کے دیکھ لیا۔ اس لیے وہ اپنی ماں کو بہت ہی آہستہ سے جواب دیتی ہے اور کہتی ہے ''میں کیا کرو...... بچہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے''۔

سماج میں اوالاد کی اہمیت کو سمجھ کر زبیدہ ہر پل اولاد کے بارے میں خواب دیکھنے لگی۔ آخرکار اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا۔ اسے چاروں طرف بچے دکھائی دینے لگے۔ شوہر سے اپنے خیالی بچوں کے لیے کپڑے اور جوتے منگاتی اور وقت بے وقت بچوں کے رونے کی آواز سن کر بے چین ہو اٹھتی۔ اپنی بوڑھی ماں سے، شوہر سے بچوں کی شرارت کے بارے میں بات کرتی۔ اس کا شوہر بیوی کی یہ حالت دیکھ کر دوکان پر جانا بند کر دیتا ہے اسے بہت پیار و محبت سے رکھنے کی کشش کرتا ہے، اس کا علاج کرواتا ہے، لیکن زبیدہ پر کسی بھی دوا، دعا کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی بیچ اس کے شوہر کی ملاقات ایک دوست سے ہوتی ہے جو اپنے معشوقہ کے حمل ٹھہر جانے سے پریشان تھا کیوں کہ وہ ابھی کوئی بچہ نہیں چاہتا تھا۔ زبیدہ کے شوہر نے اس موقع کو مناسب سمجھ کر دوست کے بچے کو اپنا بنانے کی ترکیب نکال ہی لی اور اپنی بیوی کے حاملہ ہونے کی جھوٹی خبر سنا دی۔ دوست کے یہاں جب بچہ پیدا ہوا تو زبیدہ کے شوہر نے اسے چپکے سے زبیدہ کے پاس سلا دیا اور زبیدہ کو جگاتے ہوئے کہا کہ دیکھو تم نے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔ جبکہ زبیدہ کو یقین تھا کہ اس کے چار بچے پہلے سے ہی ہیں۔ زبیدہ اسے اپنا بچہ سمجھ کر بہت پیار سے پالتی ہے۔ لیکن ایک صبح کو اس کا شوہر دیکھتا ہے کہ زبیدہ کا جسم لہولہان ہے، خون بستر پر پھیلا ہوا ہے اور زبیدہ استرے سے اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔ اس نے دوڑ کر اس کے ہاتھ سے استرا چھین لیا اور پوچھا یہ کیا کر رہی ہو؟

''زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا 'ساری رات بلکتا رہا ہے...... لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترا...... لعنت ہے ایسی............'۔ زبیدہ نے اپنی خون سے لتھڑی ہوئی انگلی بچے کے منہ میں لگا دی، اور خود ہمیشہ کی نیند سو گئی۔''

ہمارے سماج میں نہ جانے کتنی زبیدہ ایسے ہی اپنی زندگیاں قربان کر دیتی ہوں گی، کیوں کہ ان کی اپنی زندگی کا اس دنیا میں کوئی مول نہیں، کوئی مطلب نہیں۔ زبیدہ کی خاموشی کے سبب اس کے اندر پیدا ہونے والی ہیجانی کیفیت اسے ذہنی طور پر غیر متوازن بنا دیتی ہے۔ شاید اسے پتا تھا اس حالت میں، جب اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے تو اس کا جینا کس کام کا۔ اولاد کی فکر نے زبیدہ سے اس کی زندگی چھین لی۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ زبیدہ کے ذہن میں اس طرح کی فکر پیدا ہی کیوں ہوئی۔ اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ذمہ دار اور وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی اعلیٰ مخلوقات کو بھی اپنا ایک خاص تمغہ دے دیا ہے۔

فہمیدہ نے تو واضح طور پر خود سے سوال کیا آخر کیوں اس کی اپنی تمنائیں اپنی نہیں رہ گئیں، صرف اس لیے کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ زبیدہ کو اولاد کس لیے ضروری تھی اپنے لیے یا پھر اس سماج کے لیے، جہاں ایک عورت کو تبھی ایک عورت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کے بطن سے کم از کم ایک اولاد ہو۔ کیا اس سماج میں فہمیدہ جیسی عورتیں تبھی زندہ رہ سکتی ہیں یا تبھی اچھی اور سلیقے مند بیوی کہی جا سکتی ہیں جب وہ اپنی ذاتی خواہشات کو مسمار کر کے اپنے شوہر کے حکم کو بجا لائیں گی۔ یہاں منٹو نے محض ایک کہانی لکھی ہے۔ اس نے کسی سے کسی طرح کا کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ لیکن منٹوں کی یہ کہانیاں تانیثی ادب کی طرح اپنے قارئین کے ذہن پر ایک سوال قائم کرتی ہیں۔ عورتوں کا پیکر، ان کی زندگی، ان کی خواہشات، ان کی پہچان، ان کا مرتبہ اس Patriarchy نظام کے جبراً تھوپے ہوئے اصولوں کا محتاج کب تک بنا رہے گا۔ کب تک فہمیدہ اور زبیدہ جیسی عورتیں دوسروں کی خواہشات پورا کرنے کے لیے اپنی زندگیاں فنا کرتی رہیں گی۔ گرچہ منٹو Feminist یا Feminism کے پروردہ نہیں تھے لیکن ان کے آخری دور کے افسانوں میں ان کے خیال کی پختگی اردو ادب میں تانیثی ادب کی آمد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

❑❑❑

Dr. Hriday Bhanu Pratap
Assistant Professor
Department of Urdu
Zakir Husain Delhi College
New Delhi-110002
Mob. No. 7701845217

ڈاکٹر محمد شارب

قرۃ العین حیدر
اپنی تخلیق کے آئینے میں

بیسویں صدی کی خواتین فکشن نگاروں میں قرۃ العین حیدر کا نام سب سے نمایاں ہے۔انھوں نے اپنی ہمہ جہت تخلیق کے ذریعے ادب کے قاری کو باور کرایا کہ اردو افسانہ نویسی ہو یا ناول نگاری، ناولٹ کا ذکر ہو یا ترجمہ نگاری گویا تمام اصناف ادب میں وہ یدطولیٰ رکھتی ہیں۔ان کی تحریر وں میں زبان و بیان ،تصوروخیال کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی جدت پائی جاتی ہے۔ان کی کہانیاں بڑی معنیٰ خیز اور تہہ دار ہوتی ہیں جن سے قاری کو بصیرت ورسائی حاصل ہوتی ہے۔روایت سے انحراف عینی کا خاص وصف ہے۔انھوں نے اپنی راہ الگ بنائی جہاں وہ اپنے فکری وعلمی تجربات کی بنیاد پر قاری کو حصار میں لیے رہتی ہیں۔ان کے اسلوب و بیان نے نہ صرف اردوادب کو جدت عطا کی بلکہ فکشن کی سمت ورفتار بھی متعین کی۔ان کے فکشن میں موضوعات کا تنوع بدرجۂ اتم موجود ہے۔

قرۃ العین حیدر کی پیدائش ایک متوسط گھرانے میں 20/جنوری 1927 کوعلی گڑھ میں ہوئی۔مصنفہ خود اپنے نام کے متعلق بتاتی ہیں ہے کہ ”ان کے دو ماموں حسنین اورالن نے اذان واقامت ان کے کانوں میں پھونکی اور جب وہ چھ دن کی تھیں تو نام نیلوفر رکھا گیا لیکن ان کے خالو میر فضل علی نے تاج طاہرہ کے اسم گرامی پر نام ”قرۃ العین حیدر“ رکھا۔“ یہ بہت زیادہ باتونی تھیں اوراسی مناسبت سے انھیں پیار سے ”طوطا“ بھی کہا جاتا تھا۔ان کے والد کا نام سجاد حیدر یلدرم اور والدہ کا نذر زہرہ بیگم تھا جو 1912 میں شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کہلائیں۔دونوں پایہ کے اردو ادیب گزرے ہیں۔ان کا خاندان علم وادب کا گہوارہ تھا اس لیے لکھنے پڑھنے کا فن انھیں ورثہ میں ملا تھا۔سجاد حیدر یلدرم کے یہاں چھ بچوں کی ولادت ہوئی۔چار بچے بچپن میں ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ایک بیٹا مصطفیٰ حیدر عرف چھبوا اور ایک بیٹی قرۃ العین حیدر عرف عینی کے نام سے معروف رہیں۔ان کے والد نے علی گڑھ کے ایم۔اے۔او کالج سے گریجویشن کیا۔اس وقت یہ کالج الہٰ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا۔جب اس کالج نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا درجہ 1920 میں حاصل کیا توان کے والد کواس کا پہلا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔قرۃ العین حیدر کا بچپن پورٹ بلئیر میں گزرا اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم دہرادون، لاہور اور لکھنؤ میں ہوئی۔دہرادون کے غیر سرکاری اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔میٹرک پاس کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ کا امتحان 1941 میں ازبیلا تھبرن کالج، لکھنؤ سے پاس کیا۔والد کے انتقال کے بعد بھائی کو دہلی میں ملازمت مل گئی اور سبھی لوگ دہلی آگئے۔بی۔اے کا امتحان 1945 میں اندر پرستھ کالج، دہلی یونیورسٹی سے کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے 1947 میں ایم۔اے انگریزی میں کیا۔جدید انگریزی ادب کا کورس 1952 میں کیمبرج یونیورسٹی سے کیا۔اس کے بعد آرٹ کی تعلیم گورنمنٹ اسکول آف آرٹ لکھنؤ سے حاصل کی۔صحافت کی تعلیم ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنک لندن سے حاصل کی۔

انھیں تصنیف وتخلیق کے ساتھ ساتھ مصوری کا بے حد شوق تھا مشہور ایل ایم سین سے انھوں نے جاپانی واش تکنیک بھی سیکھی۔لندن میں پنچ تنتر پر بنائی ان کی الیسٹریشن کی نمائش بھی ہوئی۔عینی کے مذہب ومسلک کے اعتبار سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر مجیب احمد خاں رقمطراز ہیں کہ:

”میرے والد سنی اور والدہ شیعہ تھیں مگر میری والدہ شیعہ حضرات کی مجالس میں کم ہی جاتی تھیں اور تبرہ کی سخت مخالف تھیں۔البتہ میں سنی مسلک کی پیروی کرتی ہوں۔“

(قرۃ العین حیدر(ذات وصفحات)،صفحہ:12/11)

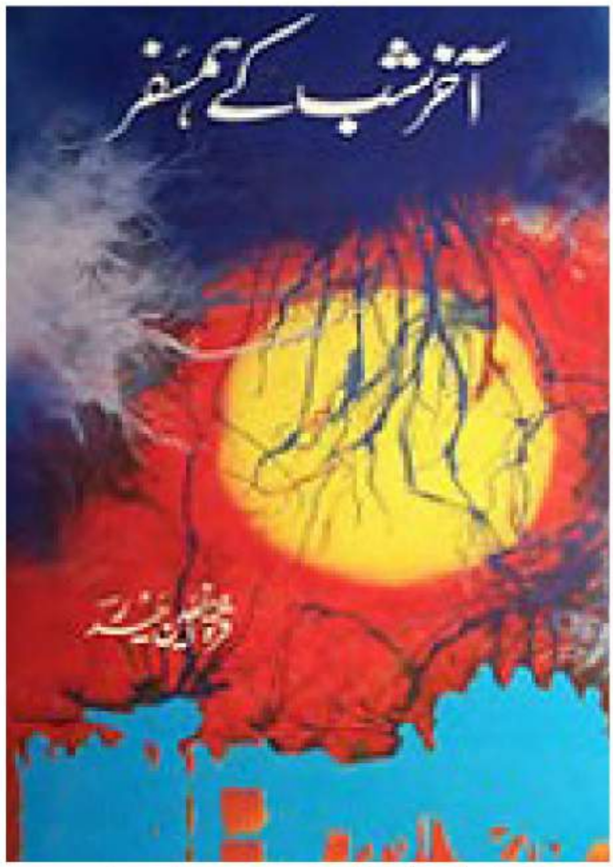

قرۃ العین کی پہلی کہانی 1939 میں 'بی چوہیا کی کہانی' بچوں کے رسالے 'پھول' لاہور سے شائع ہوئی۔ان کا پہلا افسانہ ”ایک شام“ فرضی نام 'لالہ رخ' کے نام سے 'ادیب' نومبر 1942 میں شائع ہوا۔پھر ان کا دوسرا افسانہ ”یہ باتیں“ بنت سجاد حیدر یلدرم کے نام سے رسالہ 'ہمایوں' کے مئی 1943 میں شائع ہوا۔تیسرا افسانہ ”ارادے“ قرۃ العین حیدر کے نام سے جون 1944 شائع ہوا جس پر انھیں بیس روپے کا انعام بھی ملا تو ان کے چچا مشتاق احمد زاہدی نے کہا کہ اب تم افسانہ نگار بن چکی ہو۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”ستاروں سے آگے“ ہے جو 1947 میں خاتون کتاب گھر، دہلی سے شائع ہوا۔انھوں نے انگریزی رسائل واخبارات میں بھی متعدد مضامین لکھے۔ان کا پہلا مضمون جارج برناڈ شا پر پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا۔انھوں نے مختلف شخصیات پر خاکے بھی رقم کیے ہیں جن میں عزیز احمد، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، شاہد احمد دہلوی، صدیق احمد صدیق، چودھری محمد علی رودولوی، ابن انشا، مولانا مہر محمد خان ملیر کوٹلوری، واجدہ تبسم وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی خوشحال زندگی کو 1947 تک آتے آتے زبردست دھکا لگا۔ایک تو ان کے والد کا انتقال تھا اور دوسرا تقسیم ملک کے بعد ہجرت کا سلسلہ۔ان دونوں المیوں نے ان کے ذہن، کردار اور قلم پر عمیق چھاپ چھوڑی۔یہ بھی اس ہجرت کے قافلے میں شریک ہو کر دسمبر 1947 میں پاکستان چلی گئیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے فکشن میں ذہنی اور جذباتی طور پر تقسیم ہند کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔پاکستان میں قیام کے دوران وہ محکمہ اطلاعات ونشریات میں بحیثیت اسیسٹینٹ ڈائریکٹر کام کرتی رہیں۔اس کے علاوہ پاکستان انٹرنیشنل ایر لائن (PIA) میں 1955 سے 1956 تک انفارمیشن افسر رہیں اور کچھ وقت کے لیے ”پاکستان کوارٹر“ کی قائم مقام ایڈیٹر بھی رہیں۔لندن میں 1960 میں ایک ملاقات کے دوران جواہر لال نہرو نے انھیں ہندوستان واپس لوٹ آنے کو کہا۔1961 میں وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان آگئیں اور بمبئی کی سکونت اختیار کر لی اور یہاں وہ بیس سال مقیم رہیں۔واپسی کی وجہ وہ دل و دماغ کی مشرق زدگی اور دقیانوسیت سے بیزاری بتاتی ہیں جہاں اس ماحول میں انھیں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ہندوستان میں اپنا ادبی سفر کامیابی سے آگے بڑھایا۔بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل سے کئی سال وابستگی رہی۔انگریزی صحافت سے بھی ان کا رشتہ رہا۔بمبئی میں وہ السٹریڈ ویکلی آف انڈیا کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہو گئیں اور آٹھ سال کام کیا۔اس دوران ادیبہ پر جو گزری وہ ان کی تحریروں اور کہانیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں رومانوی نقطۂ نظر حاوی ہے جس میں اعلیٰ طبقے کی زندگی اور جاگیردارانہ ماحول کو خصوصیت کے ساتھ پیش کرتی ہیں جس کی وجہ سے ان پر 'پوم پوم ڈارلنگ' کے جملے چسپاں کیے گئے۔ 68-1964 تک امپرنٹ بمبئی کی کریئر ایڈیٹر رہیں۔86-1977 تک ساہتیہ اکادمی جنرل کونسل کی اردو ایڈوائزری بورڈ کے رکن کے طور پر کام کیا جس سے دولت اور شہرت دونوں ملیں بعد ازیں جامیہ ملیہ اسلامیہ میں 1981-82 پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 84-1982 میں ویزیٹنگ پروفیسر کے عہدے پر بھی کام کیا۔اردو ادب میں ہیئتی تجربوں کی بابت

انھیں ورجینا ولف کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔انھوں نے دہلی میں مکمل سکونت اختیار کر لی۔اپنی زندگی کے آخری کچھ سال نوئیڈا میں گزارے۔مزاج کے اعتبار سے سخت تھیں لیکن جن سے دوستی ہو جاتی ان سے بہت فراخدلی اور شفقت سے پیش آتیں۔یہی وجہ تھی کہ وہ ادبی دنیا میں 'عینی آپا' کے لقب سے مشہور ہوئیں۔80 سال کی عمر میں نوئیڈا کے کیلاش ہاسپٹل میں 12/اگست 2007 کو اپنے مالک حقیقی سے جاملیں۔ان کی تدفین بعد نماز عصر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور ان کے فن پر مختلف فنکاروں نے اپنی تخلیقیت کے جوہر دکھائے ہیں جن میں ان سے انٹرویوز کا مجموعہ 'نوائے سروش' (مرتب جمیل اختر)، 'داستان عہد گل' (مرتب آصف فرخی)، 'قرۃ العین حیدر کے خطوط' (مرتب خالد حسن)، 'انداز بیاں' (مرتب جمیل اختر)، 'گل صد رنگ' (مرتب محمد حبیب خان)، 'آئینہ جہاں'، 'کلیات قرۃ العین حیدر' (مرتب جمیل احمد)، 'آئینہ حیات' کے عنوان سے ان کے چاروں ناولٹ کا مجموعہ (مرتب جمیل اختر)، 'قرۃ العین حیدر کا فن' (ڈاکٹر عبدالمغنی)، 'قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور' (خورشید انور)، 'قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن' (ڈاکٹر صاحب علی) اور قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ' (مرتب پروفیسر ارتضی کریم) وغیرہ کے علاوہ پروفیسر عبدالمغنی، امجد طفیل، اسلم آزاد اور عامر سہیل کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مختلف ادبی اعزازات سے نوازا گیا جو درج ذیل ہیں:

☆ تیسرے افسانوی مجموعے ''پت جھڑ کی آواز'' پر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں 1967 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔

☆ چند روسی ناولوں کے اردو تراجم پر محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کے ہاتھوں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ 1968 میں ملا اور روس کی سیر کرنے کا موقع

☆ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی جانب سے پرویز شاہدی کل ہند ایوارڈ 1981 میں ملا۔

☆ مجموعی خدمت کے لیے اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ برائے مجموعی ادبی خدمات 1982 میں حاصل ہوا۔

☆ غالب ایوارڈ 1984 میں ملا۔

☆ پدم شری ایوارڈ 1984 میں عطا کیا گیا۔

☆ اقبال سمان ایوارڈ (حکومت مدھیہ پردیش) 1988 میں ملا۔

☆ گیان پیٹھ ایوارڈ بدست چندر شیکھر، وزیر اعظم ہند 1989 عطا کیا گیا۔

☆ بھائی ویر سنگھ انٹرنیشنل ایوارڈ بدست ڈاکٹر شنکر دیال شرما، نائب صدر جمہوریہ ہند، 1991 میں ملا۔

☆ بھارت گورو، روٹری انٹرنیشنل ایوارڈ (غیر معمولی خدمات) 1991 میں ملا۔

☆ فیلو آف ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ 1996 میں نوازا گیا۔

☆ کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (اردو اکادمی دہلی) بدست علی محمد خسرو 2000 میں دیا گیا۔

☆ پدم بھوشن ایوارڈ سے 28/مارچ 2005 کو سرفراز کیا گیا۔

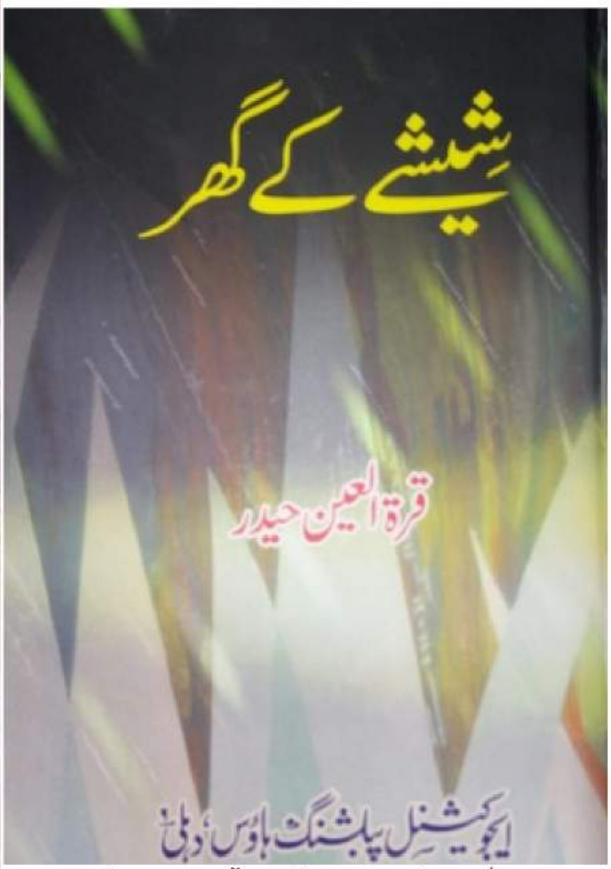

قرۃ العین حیدر کثیر التصانیف شخصیت تھیں جنھوں نے کثرت سے لکھا، پڑھا اور زندگی کے بیشتر اوقات مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں گزارے۔انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز تاریخ کے نبض پر ہاتھ رکھ کر شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے عالمی ادب پر چھا گئیں۔ان کی تقریباً سبھی تخلیقات میں تقسیم ہند کا درد اور ہجرت کا کرب نمایاں ہے۔ان کے تخلیقی ذہن نے انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا تبھی ان کے نوک قلم نے ایسے جوہر

دکھائے کہ اپنے معاصرین میں سب سے پیش پیش دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ادباء ودانشوران اردو اپنی تحریروں میں انھیں بطور حوالہ کے پیش کرتے ہیں اور ان کی تحریروں کو قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے تخلیقی کام میں سب سے زیادہ شہرت ناول نگاری کو ہی ملی۔ اگر کلی طور سے ان کے ادبی سرمایہ پر نظر ڈالی جائے تو درج ذیل تصاویر ابھر کر سامنے آتیں ہیں جن سے ان کی عظمت اور شخصیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ان کی ادبی خدمات کو ناول، ناولٹ، افسانوی مجموعے، تراجم وغیرہ کے زمروں میں منقسم کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

ناول نگاری

قرۃ العین حیدر نے اپنے کل آٹھ ناولوں کے ذریعہ اردو فکشن میں اپنی عمیق چھاپ چھوڑی ہے جن پر مختصر روشنی ذیل میں ڈالی جا رہی ہے۔ انھوں نے اردو ناول نگاری کی سمت کو متعین کیا۔ ان کے ناولوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں زندگی کا جمود نہیں بلکہ وقت کے ساتھ بہاؤ اور رفتار ہے جس کے آگے انسان کا کوئی چارہ نہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شعور کی رو کی تکنیک نے انھیں دیگر فنکاروں میں انفرادیت عطا کی ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں تاریخ، تہذیب اور وقت کو مرکزیت حاصل ہے جن کے توسط سے مصنفہ کے تخیل وتصور کو تقویت ملتی ہے اور وہ آگے بڑھتی ہیں۔ چوتھی خصوصیت ان کے ناولوں کی یہ ہے کہ ان میں ماضی کی بازیافت اور اعلیٰ طبقے کی نمائندگی ہوتی ہے اور پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہوتا ہے جو تمام خصوصیات پر بسیط ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ مغربی ادیب جیمس جوائس اور ورجینا وولف کو اپنے پیچھے چھوڑ آتی ہیں۔ کیوں کہ یہ دونوں اپنی تحریروں میں مغربی حدود کو پار نہیں کر پاتیں اس کے برعکس عینی نے نہ صرف برصغیر کو اپنے فکشن میں سمیٹا ہے بلکہ یورپ کو بھی اپنی احاطۂ تحریر میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

(1) ''میرے بھی صنم خانے'' اپریل 1949 میں مکتبہ جدید، لاہور سے منصۂ شہود پر آیا جس میں قرۃ العین حیدر نے تقسیم ہند کا منظر نامہ پیش کر ایک نظیر قائم کی ہے جو اوروں کے لیے باعث تقلید بنی۔ اس میں جاگیردارنہ طبقے کے زوال کا بیان ہے۔ مصنفہ کا یہ پہلا ناول ہے جو لاہور، پاکستان کے مکتبہ جدید سے شائع ہوا۔ جیسا کہ میں نے قبل میں ہی بتایا ہے کہ ان کا قوت مطالعہ وسیع ہے۔ انھیں فکشن کی روایت اور شاعری کی قرأت کو سمجھنے کا سلیقہ تھا جس بنیاد پر انھوں نے اقبال کی شاعری:

میرے بھی صنم خانے تیرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی

سے اثر لے کر یہ شعر مستعار لیا اور اس کا نام ''میرے بھی صنم خانے'' رکھا۔ یہ شعر اقبال کے دوسرے مجموعے 'بال جبریل' (1935) میں شامل ہے۔ ناول کے متعلق خود مصنفہ کا قول ہے کہ ''تقسیم ہند کے صدمے نے ۱۹۴۷ء کے آخر میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں مجھ سے 'میرے بھی صنم خانے' لکھوایا جو میرا پہلا ناول ہے۔''

(2) ''سفینۂ غم دل'' دوسرا ناول ہے جو 1952 میں مکتبہ جدید، لاہور سے منظر عام پر آیا۔ اس کا عنوان فیض احمد فیض کی نظم 'صبح آزادی' سے مشتق ہے جو اگست 1947 میں لکھی تھی۔

(3) ''آگ کا دریا'' دسمبر 1959 میں مکتبہ جدید، لاہور سے قرۃ العین حیدر کے پاکستان میں قیام کے دوران منظر عام پر آیا جس کا موضوع انسانی زندگی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے وقت کی رفتار کو بنایا گیا ہے اور دکھایا ہے کہ جس طرح دریا کسی کی پروا کیے بغیر اپنی روانی کے ساتھ بہتا ہوا آگے نکلتا ہے اسی طرح وقت بھی اپنی رفتار سے آگے بڑھتا جاتا ہے، وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اس ناول کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ ہندوستان کی تاریخ وتہذیب کے ڈھائی ہزار سال کو اپنے دامن میں سمیٹے ہو; ے ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق 'آگ کا دریا 30 فیصد شاعری ہے اور 70 فیصد نثر ہے'۔

یہ ناول 642 صفحات اور 101 ابواب پر مشتمل قرۃ العین حیدر کا شاہکار ناول ہے جس کا آغاز ٹی۔ ایس ایلیٹ کی نظم ''The West land'' کے چھوٹے سے ٹکڑے سے ہوتا ہے۔ ابواب 13۔1 تک شراوستی، ابواب 17۔14 تک پاٹلی پترا کی تاریخی حیثیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ابواب 25۔18 تک بہرائچ، جون پور اور بنارس، ابواب 56۔26 تک کلکتہ اور لکھنؤ کا تہذیبی منظر نامہ بیان کرتے ہیں۔ ابواب 57 اور 58 میں قدیم وجدید تاریخ کا حسین امتزاج ہے۔ ابواب 96۔59 یورپ سے متعلق ہیں، ابواب 97 اور 98 عصر حاضر کے تغیرات سے تعلق رکھتا ہے۔ ابواب 99 اور 100 میں ہندو پاک کو محور میں رکھا گیا ہے اور آخر باب میں خالص جدید ہندوستان کا بیان موجود ہے۔ اس میں کئی کردار ہیں لیکن چار کردار جن میں گوتم، چمپک، کمال اور ہری شنکر خصوصیت کے حامل ہیں۔ دیگر کرداروں میں نرملا، سرل ایشلے، عامر رضا، تہمینہ، ریکھا، شانتا، روشن، مسز سنیلا مکھرجی وغیرہ ہیں۔ مصنفہ نے وقت کو دریا سے تعبیر کیا ہے جس کا استعمال علامت کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار سال قبل کی برصغیر کی تہذیب وتاریخ مضمر ہے جو آریہ تہذیب کے ادوار سے ہوتے ہوئے گوتم بدھ اور اشوک کے بھارت کے درشن کراتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی

آمد، عربوں، ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں کے ساتھ اس دھرتی پر آنے والی اسلامی تہذیب اور ہندو سنسکرتی کے اتصال سے جنم لینے والے مشترکہ تمدنی ماحول کی زندہ مثال ہے۔

اگر اس ناول کے کرداروں کے حوالے سے بات کریں تو قدیم عہد کا 'گوتم' فلسفیانہ مزاج لیے ہوئے اپنے دور کا نمایاں طالب علم ہے جو اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مگدھ کی لڑائی میں جو پہلے عہد کے دوسرے حصے میں ہوتی ہے گنواں دیتا ہے۔ دوسرا نسوانی کردار 'چمپک' ہے جو بعد کے عہد میں چمپا اور چمپا بائی کا روپ دھارتی ہے، وہ گوتم سے سرجو ندی کے کنارے ملتی ہے، یہ ہندوستانی عورت کی تہذیب کی علمبردار ہے اور خواندہ طبقے کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے جس میں گوتم جیسے فلسفی مرد سے بحث ومباحث کرنے کی قوت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ چندر گپت موریہ سے جنگ کے دوران گرفتار ہو کر پاٹلی پترا جاتی ہے۔

دوسرے دور میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے اختلاط سے ہندوستانی تہذیب میں آئی تبدیلیوں کا ذکر ہے۔ اس دور میں 'کمال' نامی تیسرا کردار ہے جو بعد میں ابوالمنصور رکمال الدین کی صورت میں قارئین کے سامنے آتا ہے جو حسین شرقی کے کتب خانے کا نگراں ہے اور تہذیبی حوالے سے اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس کی ملاقات چمپا سے ہوتی ہے جو پہلے دور میں چمپک تھی۔

تیسرے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام، انگریزوں کے پیر جمانے اور مغلیہ سلطنت کے بکھرتے شیرازے کی داستان ہے۔ اسی دور میں گوتم کا دوسرا روپ گوتم نیلمبر سامنے آتا ہے۔ اسی میں سرل، ایشلے کا بھی کردار ہے۔ اسی دور میں چمپک کا تیسرا روپ طوائف کی صورت میں چمپا بائی کے نام سے لکھنؤ میں روشناس ہوتا ہے اور اسی دور میں کمال الدین منصور کا دوسرا کردار نواب کمن کے نام سے سامنے آتا ہے جو بعد میں کمال کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

چوتھے دور میں ہندوستان اور یورپ کے انتظامی امور اور حکمت عملی کی جھلک ملتی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ جو نسل لکھنؤ میں تیسرے دور کے آخر میں متوسط طبقے کی نمائندگی کر رہی تھی لندن، پیرس میں نظر آتی ہے اور پانچواں دور ملک کی تقسیم اور ہندو پاک کی معاشرتی وتہذیبی بحران سے وابستہ ہے۔ مختصر یہ کہ اس ناول میں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں موجود ہیں جس میں قرۃ العین حیدر نے چندر گپت موریہ، چانکیہ، شیر شاہ، شاہ حسین مشرقی، ہمایوں، ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام، غدر کی ہنگامہ آرائی، برجیس قدر، راجہ رام موہن رائے کی تحریک، رابندر ناتھ ٹیگور اور شانتی نکیتن، تقسیم ہند کا المیہ اور قیام پاکستان، ہندو مسلم فرقہ واریت وفسادات نیز ڈھائی ہزار سال کے تبدیل شدہ حادثات وواقعات کی مکمل داستان ہے۔

(4) ''آخر شب کے ہم سفر'' 1979 میں لکھا اور ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس ناول میں وقت کی بالادستی اور انسان کے خوابوں کی شکست کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ریحان اور دیپالی اس کے مرکزی کردار ہیں۔ اس کا عنوان فیض کی غزل سے مستعار لیا گیا ہے:

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

یہ ناول کمٹمنٹ اور پھر اس سے انحراف کی کہانی بیان کرتا ہے جس پر ترقی پسندوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہ ناول ۴۶ ابواب پر مشتمل ہے۔

(5) ''کار جہاں دراز ہے'' مکتبہ اردو ادب، لاہور سے شائع ہوا۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے جس کا حصہ اول 1977، حصہ دوم 1979 اور حصہ سوم 'شاہراہ حریر' کے نام ہے جو 2002 میں شائع ہوا۔ اسے قرۃ العین حیدر کا خودنوشت، سوانحی ناول قرار دیا جاتا ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی سے جڑے کئی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کو Family saga کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

(6) ''گردش رنگ چمن'' 1987 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا جس کا پس منظر صوفی سنت اور طوائفوں کا ڈیرہ ہے۔ اس کا موضوع قدیم وجدید کے درمیان کشمکش ہے جس کے نتیجے میں مختلف افراد ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار عندلیب بیگ، ڈاکٹر منصور کاشغری، دلنواز بانو، مہرو اور نواب فاطمہ ہیں۔ اس میں علامتی زبان کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔

اس کا موضوع دراصل قدیم وجدید کے درمیان کشمکش ہے جس کے نتیجے میں مختلف افراد ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس میں علامتی زبان کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ یہ ناول لکھنؤ تہذیب کو آشکارا کرتا ہے جہاں سے مصنفہ کا ایک والہانہ تعلق تھا۔ اس کے متعلق مصنفہ کا کہنا تھا کہ ''اگر اس ناول کا انگریزی ترجمہ کیا جائے تو 'دی ڈیتھ آف اے سیٹی' ہوگا۔

(7) ''چاندنی بیگم'' 1990 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں مصنفہ نے اپنے دیگر ناولوں کے برعکس شعری طرز اظہار سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔ بعض نقادوں نے اس ناول کو قرۃ العین حیدر کا آخری ناول قرار دیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک اور ناول 'شاہراہ حریر'' ۲۰۰۲ء میں مصنفہ کی حیات میں ہی منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ یوں تو ان کے بیشتر ناولوں میں وقت کی کارفرمائی

ہوتی ہے لیکن اس ناول کے مطالعے کے بعد قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کو دیگر موضوعات پر بھی دسترس حاصل تھی۔ لیکن بعض ناقدین نے اس کا موضوع زندگی، زمانہ، زمین، وقت اور موت کو بتایا ہے۔ اس ناول میں 1947 کے بعد مسلم خاندان کے جذبات و احساسات کی عکاسی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح کی المناک صورت حال سے اشرافیہ طبقے کے لوگ دوچار ہوئے۔ خاص طور پر پاکستان ہجرت کرنے کی وجہ سے معاشرتی توازن بگڑا۔ لڑکیوں کے لیے مسائل پیدا ہوئے۔ زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے بہت سے المیوں نے جنم لیا جن میں لڑکیوں کی شادی نہ ہونا یا اچھے لڑکوں کا نہ ملنا بھی شامل ہے۔ اس ناول کو عمرانیاتی تناظر میں بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس میں شیخ اظہر علی کی کوٹھی، ریڈ روز اور راجہ انوار حسین کی کوٹھی تین کٹوری ہاؤس یہ محض عمارتیں نہیں بلکہ تہذیبی و ثقافتی علامتیں بھی ہیں۔

(8) ''شاہراہِ حریر'' قرۃ العین حیدر کا آخری ناول ہے جو 2002 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا۔

ناولٹ:

قرۃ العین حیدر نے جہاں سات ناول لکھے وہیں چھ ناولٹ کی بھی تخلیق کی ہیں جن میں:

(1) سیتا ہرن۔ 1960 میں نیا دور، کراچی سے شائع ہوا۔ اس کا موضوع عورتوں کا استحصال ہے۔

(2) چائے کے باغ۔ 1964 میں حلقۂ ادب، بمبئی سے شائع ہوا۔ یہ مشرقی پاکستان (بنگال) کے امیر طبقے کے ہاتھوں غریب محنت کشوں کے استحصال کے خلاف دردناک تحریر ہے۔

(3) ہاؤسنگ سوسائٹی۔ 1966 میں شائع ہوا۔ مجموعہ پت جھڑ کی آواز میں شامل ہے۔ اس میں جاگیردارانہ نظام کے زوال کو مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

(4) اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔ 1977 میں بیسویں صدی، دہلی سے شائع ہوا۔

اس میں عورت ذات کی زبوں حالی اور معاشرے کے ایک المیے کو اس انداز میں بیان کیا کہ یہ بیان کا لافانی حصہ بن گیا ہے۔

(5) دل ربا۔ 1976، اس میں تھیٹر اور مختلف زمانے میں تبدیل ہوتی تہذیب کو فوکس کیا گیا ہے۔

(6) فصل گل آئی یا جل آئی۔

افسانوی مجموعے:

(1) ''ستاروں سے آگے'' (پہلا افسانوی مجموعہ) 1947

(2) ''شیشے کے گھر'' 1954 میں مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا۔

(3) پت جھڑ کی آواز:۔ یہ مجموعہ مکتبہ جامعہ، دہلی سے 1965 میں شائع ہوا اور 1966 میں اردو کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ اس میں کل آٹھ افسانے شامل ہیں۔

(4) روشنی کی رفتار:۔ یہ مجموعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے 1982 میں شائع ہوا۔ اس میں کل اٹھارہ افسانے شامل ہیں (5) جگنوؤں کی دنیا 1990 (6) کف گل فروش (7) داستان عہد گل (8) پکچر گیلری۔ یہ عینی کے اردو مضامین کا مجموعہ ہے۔

(9) قندیل چین (نیا افسانوی مجموعہ، مرتب جمیل اختر) 2007

رپورتاژ:

(1) لندن لیٹر۔ اسے عینی نے 1953 میں لکھا جو 'شیشے کے گھر' میں 1954 میں شامل ہوا۔

(2) ستمبر کا چاند۔ جون/1958 میں نقوش، لاہور سے شائع ہوا (اس نام سے رپورتاژ کا پہلا مجموعہ 2002 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے منظر عام پر آچکا ہے، اس میں چار رپورتاژ شامل ہیں)

(3) چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔ 1966 میں اپریل/جون کے شمارے نقوش، لاہور سے شائع ہوا۔

(4) در چمن ہر ورقی دفتر حال دیگر است۔ 1968 نقوش میں شائع ہوا۔

(5) کوہ دماوند۔ آج کل، دہلی سے 1978 (اسی نام سے دوسرا مجموعہ بھی 2000 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہو چکا ہے، جس میں چھ رپورتاژ شامل ہیں۔)

(6) قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔ 1983 میں ادب لطیف، لاہور سے شائع ہوا۔ یہ رپورتاژ ایران کے انقلاب پر مبنی تھا جس کا عنوان مرزا سلامت علی دبیر کے مرثیے سے اخذ کیا گیا ہے۔ عینی نے ایک مضمون 'عالم آشوب' کے نام سے لکھا تھا جو مذکورہ مضمون کے ایک ذیلی عنوان کا نام ہے۔

(7) گلگشت۔ مکتبہ اردو ادب، لاہور سے شائع ہوا۔

(8) جہان دیگر۔ یہ بھی مکتبہ اردو ادب، لاہور سے شائع ہوا۔

(9) خضر سوچتا ہے دولر کے کنارے

(10) دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں۔ اس کا عنوان ملا وجہی کے ایک مصرع سے مشتق ہے۔ یہ عینی کے سفر حیدرآباد کی یاد کو اپنے اندر سمیٹے

ہوئے ہے۔ انھوں نے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے اسرار پر رسالہٗ انکار کے پہلے شمارے کے لیے لکھا تھا۔
(11) پدماندی کے کنارے

تراجم:

(1) ہمیں چراغ ہمیں پروانے Portrait of a lady on fire 1958 by Henry Games) مطبع: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور)

(2) ڈنگو، ناول آرفر یمین، آسٹریلیا، مطبع: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

(3) آلپس کے گیت، ناولواسل بائی کوف، روس، 1969 مطبع: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

(4) کلیسا میں قتل Murder in the Cathedral by T.S Eliot

(5) تلاش Breakfast Tiffany by Truman Capote

بچوں کے لیے کہانیاں: انگریزی سے اردو ترجمہ

(1) لومڑی کے بچے (2) بہادر گھوڑے (3) میاں ڈھینچو کے بچے (4) شیر خان (5) بھیڑیے کے بچے (6) ہرن کے بچے (7) ڈینگو

متفرقات: (ترتیب شدہ کتابیں)

(1) دامانِ باغباں (خطوط کا مجموعہ) 2003 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوئی۔

(2) کف گل فروش (حصہ اول) سیاہ سفید تصاویر کا البم ہے جو 2004 میں اردو اکادمی، دہلی سے شائع ہوئی۔

(3) کف گل فروش (حصہ دوم) رنگین تصاویر کا البم ہے جو 2004 میں اردو اکادمی، دہلی سے شائع ہوئی۔

(4) استاد بڑے غلام علی خاں ہز لائف۔ مالتی گیلانی کے ساتھ انگریزی میں ترتیب دی جو ہر آنند پبلی کیشنز، اینڈ میوزک، دہلی سے 2003 میں شائع ہوا۔

(5) ہوائے چمن میں خیمۂ گل (کلیات نذر سجاد حیدر) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے 2004 میں منظر عام پر آئی۔

قرۃ العین حیدر کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ان کا تجربہ بھی بڑھتا گیا۔ ان کی ذہنی پختگی نے خواب و خیال کی دنیا کو آباد کرنے سے اجتناب کرتے ہوئے حقیقت کی ترجمانی کرنے پر آمادہ کیا جس کا واضح اثر ان کی بعد کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی تحریروں کی یہ تبدیلیاں ان کے

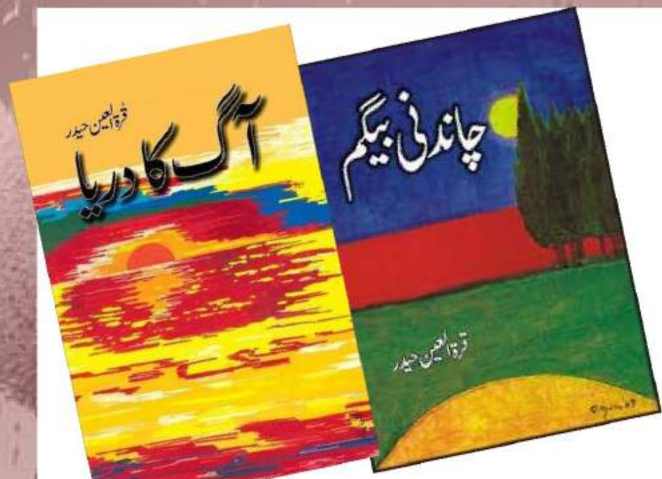

ذہنی شعور کی پختگی اور بالیدگی کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی شخصیت بے نظیر تھی اسی لیے ان کے تعلقات کا دائرہ بھی وسیع تھا۔ وہ تمام موضوعات پر کھل کر بحث و مباحثہ میں حصہ لیتیں ساتھ ہی کچھ ناگوار گزرنے پر اپنے ساتھیوں کو بھی آڑے ہاتھ لینے سے گریز نہیں کرتیں۔ انھوں نے تصوف کے رموز و اسرار کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کو خوب باریکی سے سمجھا بھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں صوفیائے کرام کی عظمت اور ان کا احترام جا بجا نظر آتا ہے۔ انگریزی شاعری سے بھی ان کی دلچسپی تھی جہاں انھوں نے تجریدی اور علامتی نظموں پر زور آزمائی کی ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں جدت و ندرت کے ساتھ حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر اوروں کے لیے مشعل راہ بنی۔ جب انھوں نے قلم اٹھایا تب تاریخی حقیقت نگاری کی جانب کم لوگوں کا رجحان تھا۔ عینی نے نہ صرف اپنی تحریروں میں تاریخ کا بھرپور استعمال کیا بلکہ اس میں تخیلات و تصورات کے عناصر شامل کر کے انھیں اور بھی حسین بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول و افسانوں میں تاریخی فضا، رومانی تخیل، نفسیاتی ماحول اور فلسفیانہ فکر کا حسین امتزاج نمایاں ہے۔ قرۃ العین حیدر تاریخ و تہذیب کی کامیاب تخلیق کار تھیں جنھیں حسن اسلوبی کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ عہد حاضر کی اس تہذیب کی پروردہ تھیں جس سے ہم محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

□□□

Dr. (Mr.) Md. Sharib
Vill. Mandeya, Masihani
P.O.& P.S- Chhattarpur
Dist. Palamu- 822113 (Jharkhand)
Mob. 9835938234

لکھنوی تہذیب اور مسرورِ جہاں کے افسانے

شائستہ عالم

شہر لکھنؤ اپنی مخصوص تہذیبی وثقافتی، علمی وادبی وراثت کے سبب مشہور رہا ہے۔ یہاں کی عمارات، یہاں کی عظیم شان وشوکت، یہاں کی متنوع تہذیب وثقافت ہمیشہ سے عوام اور بالخصوص ادیبوں وشاعروں کو اپنی جانب متوجہ کرتی رہی ہے۔ آصف الدولہ کی مسند نشینی کے ساتھ جب لکھنؤ نوابین اودھ کا مرکز بنا اسی وقت سے اس کا مقدر و مستقبل روشن ہوگیا۔ چند برسوں کے اندر ہی یہاں کی تہذیب وثقافت اپنا ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے نقطۂ عروج تک پہنچ گئی۔ علم وہنر، فنونِ لطیفہ، رقص وموسیقی، ڈرامے ومشاعرے لکھنؤ کی نفاست ونزاکت، شادی بیاہ، رسم ورواج، عقائد وروایات غرض زندگی کے تمام شعبوں میں لکھنؤ نے ایک امتیازی مقام حاصل کرلیا۔ جیسا کہ گزشتہ لکھنؤ کے مصنف عبدالحلیم شرر کے الفاظ اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ:

> ”ان دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق سے پُر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج وعروج کا مقابلہ نہ کرسکتا ہوگا۔“

(گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 2011، ص:71)

لکھنؤ کے رونق افروز ہونے اور امتیازی شہرت حاصل کرنے میں جن چیزوں کی کارفرمائی تھی ان میں یہاں کی زرافشانی اور ہنرپروری ایک اہم وجہ تھی جس نے باکمالوں کو اپنی جانب متوجہ کیا اور علوم وفنون کے علاوہ دیگر عیش وعشرت اور سیر وتفریح کے نت نئے در وا کیے لیکن لکھنؤ میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھنا، ان کا مطلق العنان ہونا، یہاں کی مرکزیت ماند پڑنا اور اس کے بعد 1857 کا انقلاب، یہ ایسے سانحے ہیں جنھوں نے لکھنؤ کی تاریخ کے روشن باب پر جو کاری ضرب لگائی اس کی حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایک پل میں یہ بارونق چمن ویران ہوگیا اور زندگی کا شیرازہ کچھ ایسا بکھرا جس کا تصور بھی حساس طبع کے لیے شاق ہے اور وہ تہذیب وثقافت جو اس جنت نشان کا خاصہ تھی مرحلہ بہ مرحلہ روبہ زوال ہو گئی۔ حسب دستور محکوم قوم فطری طور پر زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے حاکم کی پیروی اور غیر محسوس طور پر ان کے طور طریقوں کو اختیار کرنے لگتی ہے یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ لہٰذا واضح طور پر فکری وتہذیبی کشمکش دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک طبقہ عوام کا ایسا تھا جو پرانی تہذیب کا دلدادہ تھا اور ایک طبقہ نئی تہذیب پر فریفتہ ہو رہا تھا ایک فریق پرانی تہذیب کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنا چاہتا ہے اور دوسرا نئی تہذیب کے ساتھ قدم ملانے کو بے قرار ہے۔ متعلقہ دور کے تمدنی انتشار نے متعدد قلمکاروں کی توجہ مائل کی جن میں ایک اہم نام مسرور جہاں کا بھی ہے۔

اسی شہر لکھنؤ میں مسرور جہاں نے اپنا عہد طفلی گزارا۔ یہاں پرانی

تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش، مفقود ہوتی ہوئی قدریں، ٹوٹتے بکھرتے انسانی رشتے اور اس طرز زندگی کو رفتہ رفتہ ختم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہی وہ تجربات و مشاہدات ہیں جو ان کے لاشعور کا حصہ بن کر ان کے افسانوں اور ناولوں کو مواد فراہم کرتے ہیں۔

مسرور جہاں کے الفاظ میں :

''میں نے جس زمانے میں آنکھ کھولی یہ معاشرہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔
ایک جلوس جہاں نئے راستوں پر گامزن تھا وہیں گزرے ہوئے وقت کے مرثیہ خواں ابھی بھی اس ماضی کے مجاور تھے جو کبھی ناپید ہو چکا تھا اور میرے سامنے لکھنؤ کی اس تہذیب کے مٹے مٹے نقوش تھے جن کے اثر و آثار اب تاریخی حوالوں تک محدود رہ گئے ہیں''۔

(اپنی بات، اللہ تیری قدرت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص:9)

مسرور جہاں نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا مگر خود کو کسی خاص گروہ میں شامل نہیں کیا نہ ہی کسی مخصوص نظریہ کا پابند بنایا۔ ان کے افسانوں کا غالب رجحان عورت اور اس کے مسائل، معاشرے کی صحت مند اقدار کے فقدان، اور قدیم و جدید کی کشاکش پر مبنی ہے جس کا بیان وہ لکھنؤ کی سلیس و نویس، خوبصورت اور بامحاورہ زبان میں کرتی ہیں اور اپنی حقیقت بیانی و عینیت پسندی سے اس کے ہر ادنیٰ گوشے کو منکشف و منور کرتی ہیں۔

لکھنؤ کی طرزِ معاشرت، آداب و اطوار، نشست و برخاست یہاں کی عظمت رفتہ، تاریخی عمارتیں، امام باڑے، محلات، ڈیوڑھیاں، یہاں کے محلوں اور حویلیوں کی تصویر کشی، طبقۂ اشرافیہ کی شان و شوکت و دیرینہ روایات، نوابین و بیگمات اور ان کے خدمت گاروں کا ذکر اس فنی خوبی سے پیش کرتیں ہیں کہ ہر منظر و کردار کی تصویر قاری کے تخیل میں رقصاں ہو جاتی ہے۔ مسرور جہاں اپنے قلم سے قاری کو اس جیتے جاگتے لکھنؤ کی سیر کراتی ہیں جو اب واقعی تاریخی حوالوں تک محدود رہ گیا ہے۔

افسانہ ''میاں کی حویلی'' سے ایک اقتباس :

''اونچی برجیوں والا بلند و بالا شاندار پھاٹک۔ دیکھ کر اس کی عظمت کا احساس ہوتا تھا۔ خوبصورت محرابوں والے سات دروں کے دوہرے تہرے دالان، کشادہ صحنچیاں اور رنگین شیشوں والے دروازوں کے عقب میں کھلنے والے بڑے بڑے ہال، جھلمل والی کھڑکیاں حویلی کا قیمتی اثاثہ تھیں۔ وسیع و عریض صحن موتیا، بیلا، موگرا اور رات کی رانی سے مہکتا تھا۔ گرمیوں میں چھڑکاؤ کر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نواڑی پلنگ بچھائے جاتے تھے۔ جن پر سفید براق چادریں کسی رہتیں ... حویلی کیا تھی ایک مکمل سلطنت تھی''۔ (میاں کی حویلی، کہاں ہو تم!، مسرور جہاں، ص:137)

ایک زلزلہ کے بعد کی صورتِ حال ملاحظہ ہو جب دیگر عمارتیں زمین دوز ہو رہی تھیں:

''حویلی کے پچھواڑے زیرِ تعمیر بلڈنگ ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی اور میاں کی حویلی اس شان سے سَر اُٹھائے کھڑی تھی۔''

(میاں کی حویلی، کہاں ہو تم!، مسرور جہاں، ص:143)

یہ استعارہ ہے پرانی تہذیب کی پائیداری اور نئی تہذیب کے کھوکھلے پن کا جس کی عکاسی مسرور جہاں کے افسانوں میں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

شارب ردولوی کے الفاظ میں :

''مسرور جہاں نے چیزوں کو ٹوٹتے بکھرتے دیکھا ہے اور وہ نسل جو تہذیبی طور پر اس طرح کے کسی عمل سے گزرتی ہے وہ زیادہ حساس اور نازک ہو جاتی ہے۔ وہ نئی اقدار کو قبول تو کر لیتی ہے اور بظاہر خوش بھی رہتی ہے لیکن وہ ان کو بھول نہیں پاتی۔ مسرور جہاں کے افسانے پڑھتے وقت جس بات کا شدّت سے احساس ہوتا ہے وہ متضاد تہذیبی عمل ہے۔''

(مسرور جہاں کی افسانہ نگاری، شارب ردولوی، مشمولہ نقل مکانی، مسرور جہاں، ص:8)

اور اس متضاد تہذیبی عمل میں مسرور جہاں کی حمایت واضح طور پر لکھنؤ کی قدیم تہذیبی اقدار کے ساتھ ہے۔ جب زندگی نسبتاً پُرسکون تھی، گھروں میں آنگن ہوا کرتے جن میں افراد خانہ ایک ساتھ وقت گزارتے اور مختلف النوع مسائل و موضوعات پر خوش دلی سے تبادلۂ خیال ہوتا، چھوٹے بڑے کا لحاظ تھا، پشتینی اور جانثار خدمت گار ہوا کرتے لیکن جب نظام معاشرت کے انداز بدلے تو یہ دیرینہ خاندانی وراثتیں بھی متغیر ہو گئیں حتیٰ کہ انھیں پہچاننا بھی دُشوار ہو گیا۔ نوابوں اور راجاؤں کے عالی شان محل، پانچ ستارہ ہوٹل بننے لگے یا انھیں عجائب خانہ بنایا جانے لگا۔ گھر جو حویلی کہلاتے تھے انھیں کثیر منزلہ عمارت بنایا جانے لگا چنانچہ سماجی اور تہذیبی قدروں کا زوال شروع ہو گیا۔ نئی نسل مادیت پرستی کی طرف مائل ہوئی اور والدین کی خدمت و اطاعت ان پر گراں گزرنے لگی جہاں کبھی اپنی ذات پر 'پہلے آپ' کو فوقیت دی جاتی تھی وہاں اب نئی نسل 'ہمیں ہم' کی مصداق

ہوگئی جہاں کبھی ہم آہنگی فروغ پاتی تھی وہاں احساس اجنبیت وعدم مطابقت فروغ پانے لگی۔

'میاں کی حویلی'، 'بیساکھیاں'، 'جڑیں'، 'شناسائی'، 'نور بے نور'، 'صلہ' انھیں موضوعات پر پیش کیے گئے افسانے ہیں، جن میں لکھنؤ کی عظمتِ رفتہ کا بیان اپنے عروج وصعود پر ہے۔افسانہ 'جڑیں' میں پرانی قدروں کے پاسبان ایک والد نے اپنے بیٹے 'فیصل' کو گھر سے نکال دیا مگر اس بات پر رضامندی نہیں دی کہ اس کے صحن میں لگے ہوئے نیم کے درخت کو کاٹ دیا جائے کیونکہ اس کی جڑیں صرف زمین میں ہی نہیں بلکہ ان کے دل میں بھی پیوست ہیں۔ پرانی تہذیب کے بدلے نئے کلچر کے تسلط کا تذکرہ افسانہ 'پچھلا دروازہ' میں دیکھنے کو ملتا ہے اس افسانے میں ایسی حویلی کا تذکرہ ہے جس نے کبھی باغ و بہار دن دیکھے ہوں گے مگر اب اس کے کشادہ صحن میں ویرانی اور خاموشی کا بسیرا ہے۔تین افراد پر مشتمل یہ حویلی شہر کے اس علاقہ میں اپنی دیرینہ روایات کا پتہ دے رہی ہے جہاں آس پاس نئی نئی فلک بوس عمارتیں تیار ہوچکی ہیں اور لوگ ان محدود ربع وقطع کے فلیٹ میں زمانے کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے باخوشی رہنے کو تیار ہیں جہاں ہوا اور روشنی کا گزر بھی مشکل سے ہے اس طرح دو مختلف المزاج طرز زندگی ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی ہوگئی ہیں۔

افسانہ 'صلہ' میں رحمت بوا کی بے لوث خدمت گزاری کا ذکر ہے۔ والدین کے عدم تحفظ کے مسئلہ کو 'بیساکھیاں'، 'کرن پھول' میں پیش کیا گیا ہے 'گول کوٹھی' میں عارف، شبّو، اور 'ہمسفر'، 'ہمسفر اکیلا ہے' میں عرفی اور شمو کی محبت کا تذکرہ ہے جو اس دور میں پاس ولحاظ کے پیشِ نظر اپنے بزرگوں کے سامنے جرأت اظہار بھی نہ کرسکی چہ جائے کہ مخالفت اور گھر خاندان وعزت کی نذر ہوگئی۔

افسانہ 'کنجی' میں اس دور کے لکھنؤ کا ذکر ہے جب نوٹنکی جیسا تماشہ دیکھنے میں عزت دار لوگوں کے لیے کوئی قباحت نہیں تھی اس وقت تک سینما کا رواج عام نہیں ہوا تھا اس دور میں لڑکیوں کا اسٹیج پر آکر تماشا دکھانا معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے لڑکی کا کردار بھی عموماً لڑکے ہی ادا کرتے تھے مسرور جہاں کی زبانی کنجی کا سراپا ملاحظہ ہو جو درحقیقت ایک مرد ہے:

> ''چھریرا جسم، پتلی کمر، گورا گلابی مائل رنگ، کتابی چہرے پر روشن آنکھیں، پتلے پتلے متبسم لب، ستواں ناک میں لشکارا مارتی ہیرے کی لونگ، کمر تک لہراتے ہوئے چمکیلے سیاہ گیسو۔ سچ مچ کے گیسو۔ خدا نے گویا اس کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔'' (کنجی، تیرے میرے دکھ، مسرور جہاں، ص:35)

اس سراپے کے پس منظر میں اس تہذیبی نظام کا بیان بھی روپوش ہے جس میں دلگی وتفریح طبع کے امور میں بھی خواتین کے منصب کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی شمولیت سے گریز کیا جاتا تھا مگر وقت اس سبک خرامی سے آگے بڑھا کہ یہ تمام حزم واحتیاط طاق نسیاں کی نذر ہوگئے۔نئی ثقافت خودنمائی اور نمود ونمائش کا ایسا طوفان اپنے ساتھ لائی جس کے نتیجے میں قدیم روایات کی پرداداری خاموشی کے ساتھ حاشیہ پر چلی گئی۔

مسرور جہاں کے افسانوں میں قدیم وجدید میں کشمکش ضرور موجود ہے لیکن تصادم کی نوبت نہیں پیش آتی۔انھوں نے نئی تہذیب کو یکسر مسترد بھی نہیں کیا بلکہ تبدیلیوں کو زندگی کی حقیقت خیال کرتے ہوئے اس کے صالح ومثبت پہلوؤں کو قبول بھی کیا مثلاً امرد پرستی کا زوال، شاہد بازاری سے تعلقات اور میل جول جو پہلے اجزائے تہذیب میں شامل تھے انھیں معیوب سمجھا جانے لگا، عہدِ طفلی کی شادی اور اس کے دردناک نتائج اس کے علاوہ تعلیم کا شعور بالخصوص خواتین میں جس کے نتیجے میں ان میں خوداعتمادی اور استحکام پیدا ہوا۔

افسانہ 'کل کی سیتا آج کی سیتا' سے اقتباس :

> ''بے شک! میں نے ریتو کو اس لیے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی کہ وہ میری طرح بُزدِل نہ نکلے اور اپنے جیون کا فیصلہ خود کرے۔ میری طرح نہیں کہ ماں باپ نے جہاں جھونک دیا اُسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا۔''

(کل کی سیتا آج کی سیتا، تیرے میرے دکھ، مسرور جہاں، ص:109)

مسرور جہاں کی زندگی کا بڑا حصہ تصنیف وتالیف میں گزرا، لکھنؤ ان کا وطن ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کا مرکز بھی رہا جس کو بنیاد بنا کر انھوں نے اپنے افسانوں کی فضا ہموار کی اور معاشرہ کی اصل تصویر پیش کرنے کی سعی کی ہے یہ تصویر کہیں دھندلی ہے کہیں واضح لیکن صحیح عکاسی اور ایمانداری سے پیش کی گئی ہے اس لیے نہایت پُرکشش وموثر ثابت ہوئی ہے۔

□□□

Shaista Alam
Research scholar
Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

فردوس انجم شیخ آصف

ہندوستانی معاشرے میں 'عورت' سے منسوب محاورات اور کہاوتیں

ہندوستانی معاشرے کا نام آتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے ممتاز ملی جلی تہذیب و ثقافت کا ایک رنگین چمن کھلتا اور خندۂ گل کی طرح مہکتا نظر آتا ہے۔ اس چمن کو کھلتا اور مہکتا بنانے میں یہاں کے بھانت بھانت کے لوگ برابر شریک ہیں اور ان کے اظہارِ خیال کا ذریعہ زبان جو انسان کے سماجی عمل کا ایک نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے یہاں کی سماجی زندگی جو ایک طویل عرصے سے کسی نمایاں تبدیلی سے دوچار نہیں ہوئی تھی ایک نئی راہ پر چل پڑی، موسیقی، مصّوری اور تصّوف کی طرح زبانوں نے بھی اسلامی تمدّن کے اثرات قبول کیے، اور مشترکہ تہذیبی اقدار کی طرح زبانوں میں بھی نمایاں خصوصیات پیدا ہوگئیں۔ نتیجتاً اس مشترکہ تہذیب کی امین اردو زبان وجود میں آئی۔

اردو زبان کی خوبی اس کی سلاست، عام فہمی، نرمی، موزونی، چھوٹے چھوٹے الفاظ اور بڑے بڑے مطالب پر موقوف ہے۔ اس میں محاورات اور کہاوتیں وہ ننھے مرقع ہیں جو کسی سماج کے تجربات، تصورات اور تاثرات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہندوستانی سماج میں آج اردو زبان کی اصلاح کے بعد جو قدیم لب و لہجے کی گونج ہمیں سنائی دیتی ہے، اس کا سہرا مردوں سے زیادہ عورتوں کے سرَ ہے۔ کیونکہ عورتیں زبان کے معاملے میں قدامت پسند ہوتی ہیں۔ عورتوں کی نمایاں خصوصیات انتخابِ الفاظ کے سلسلے میں یہ ہے کہ وہ کریہہ الفاظ کی جگہ لطیف الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ عورتیں جنسیات سے متعلق باتیں واضح الفاظ میں کہنے کے بجائے اشارے کنائے میں بیان کرتی ہیں۔ مثلاً میلے سر سے ہونا، گود میں پھول جھڑنا، دو جیاں ہونا، جیسے متعدد محاورے عورتوں نے مختلف کیفیات کو ظاہر کرنے کے لیے ہیں جن کا چلن آج بھی ہے۔

زبان سے ملک کا سکّہ ہے عورت
انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے
زبان کا فیصلہ ہے عورتوں پر
یہ باتیں مردوئے لائیں کہاں سے

(اردو محاورات کا تہذیبی مطالعہ، ڈاکٹر عشرت جہاں ہاشمی، ص40)

عورتیں نئی نئی اصطلاحیں، محاورے وضع کر لیتی ہیں جن میں اکثر خوش آواز، مترنم اور پر لطف، ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر زبان کی لغت میں ایک ایسی فرہنگ موجود ہوتی ہے جو عورتوں کی بول چال کے لیے مخصوص ہے۔ مردوں کی گفتگوں میں اس طرح کے الفاظ شاید ہی ملیں گے۔ اردو نثر میں عورتوں کی بول چال کم و بیش طلسم ہوش ربا، باغ و بہار اور دیگر نثری داستانوں میں گویا سمٹ آئی ہے۔ عورتوں سے ماخوذ محاورات اور کہاوتوں پر نظر ڈالے تو آنکھوں کے سامنے رمز و کنائے کا ایک رنگین گلستاں نظر آئے گا۔ خواتین سے متعلق محاوروں کو انھیں مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆ **ابلا سُبلا، اُبالا سُبالا**۔۔۔ یعنی بے ذائقہ چیز۔ ابلا سبلا ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کسی عورت کو اچھا سالن بنانا نہیں آتا، اس سے ہم اس گھریلوں ماحول کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہاں ایک عورت کی کھانا پکانے کی صلاحیت میں گھر کے حالات کا عکس موجود ہوتا ہے۔

☆ **ابلا پری، ابلا رانی ہونا**۔۔۔ بہت خوبصورت ہونا۔ قدیم ہندوستان میں 'پریوں' کا تصور نہیں تھا۔ اسی لیے 'ابلا رانی' کہا جاتا تھا۔ لیکن جب فارسی کے ذریعے 'پری' کا تصّور آیا تو 'ابلا پری' کہا جانے لگا۔ اسی طرح ہندی میں 'ابلا ناری' رائج ہے۔ ان سب سے مراد حسین عورت ہے جسے 'پری چہرہ' بھی کہتے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت امیر خسرو کا مشہور فارسی شعر ہے۔

پری پیکر، نگار سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپہ آفتِ دل بود، شبِ جائے من بودم

(اردو محاورات کا تہذیبی مطالعہ، ڈاکٹر عشرت جہاں ہاشمی، ص/53)

☆ **اپنی ایڑی دیکھو**۔۔۔ ایڑی پاؤں کا پچھلا اور نچلہ حصّہ ہوتا ہے۔ جسے ہماری نظر کم دیکھ پاتی ہے، اس معنی میں ایڑی ایسی چیزوں کی طرف اشارہ ہے جن کو انسان نہیں دیکھتا۔ اسی لیے عورتیں اپنی مخالف عورت سے کہتی ہیں کہ مجھے کیا کہہ رہی، " اپنی ایڑی دیکھ۔

☆ **اپنی گڑیاں آپ سنوارنا**۔۔۔قدیم معاشرے میں لڑکیوں کو پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے گڑیوں کے کھیل کے ذریعے بچّیوں کو گھر گرہستی کے، بہت سے کام سکھائے جاتے تھے۔ اس طرح اس سے منسوب باتیں معلوم ہو جاتی تھیں۔ جیسے، اپنی گڑیاں سنوارنا، اپنی گھر گرہستی کو بہتر بنانا، اپنی بچّیوں کی دیکھ بھال کرنا، ان کو سلیقہ سکھلانا وغیرہ۔ گڑیوں کا بیاہ، گڑیوں کا کھیل، اسی نہج کے محاورے ہیں۔

☆ **اجلی سمجھ، اجلی طبیعت**۔۔۔اجلی طبیعت عورتوں کی خاص طرح کی سوجھ بوجھ اور عقل و دانش کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اندھیرا یا اجالے کا تعلق صرف صبح و شام یا دن رات کی تبدیلی سے نہیں بلکہ انسانی ذہن، فطرت، سوجھ بوجھ اور ناسمجھی سے بھی ہے۔

☆ **اللہ ماری یا خدا ماری**۔۔۔ یہ خالص عورتوں سے متعلق محاورہ ہے اس محاورے کو عورتیں اس وقت بولتی ہیں جب وہ نگوڑا اور مُوا وغیرہ الفاظ بولتی ہیں۔

☆ **آبخورے بھرنا**۔۔۔عورتوں میں اکثر یہ خاصیت ہوتی ہیں کہ وہ منّتیں مانتی ہیں، اپنے بچوں کے لیے، رشتہ داروں کے لیے، میاں کی کمائی کے لیے، اور ایسی ہی دوسری باتوں کے لیے،۔۔ کہتی ہیں کہ اے اللہ اگر میری یہ دعا قبول ہو گئی تو میں دودھ یا شربت سے آبخورے بھر دوں گی۔

☆ **آکھ کی بڑھیا**۔۔۔ ہمارے معاشرے میں بوڑھی عورت اپنے سفید بالوں کے ساتھ بچوں اور بڑوں کو کسی نہ کسی خاص معنی میں متاثر کرتی ہے۔ خاص کر تلخ مزاج بڑھیا کو آکھ کی بڑھیا کہتے ہیں۔

☆ **پاؤں میں مہندی لگا ہونا یا لگنا**۔۔۔عورتوں کا محاورہ ہے۔ عورتیں جب مہندی لگاتی ہیں تو مہندی لگے پیروں سے کہیں آنا جانا ممکن نہیں ہوتا اسی لیے طعنہ یا طنز کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ایسا بھی کیا ہے کہ آپ نہیں آسکتے، کیا پیروں میں مہندی لگی ہے۔ ایک طرح کا شکوہ کیا جاتا ہے۔

☆ **چمک چاندنی**۔۔۔ایسی عورت کو کہا جاتا ہے جو بہت چمک دمک سے رہتی ہے اور غیر ضروری طور پر سنگار کرتی ہے۔

☆ **چولی دامن کا ساتھ**۔۔۔ گھر کی بزرگ عورتیں بہو، بیٹیوں کو دعا (آشرواد) کے طور پر استعمال کرتی ہیں کہ تمھارا چولی دامن کا ساتھ رہے۔ مطلب بیوی اور شوہر کا ساتھ چولی اور دامن کی طرح ہمیشہ رہے۔

☆ **چھوئی موئی**۔۔۔ایسی لڑکیوں یا عورتوں پر طنز ہیں جو بہت نازک مزاج ہوتی ہیں۔ جو ذرا ذرا سی بات پر برامان جاتی ہیں۔

☆ **سیج چڑھنا**۔۔۔ ہماری تہذیب میں لڑکی پیدا ہوتے ہی اس کی شادی کی فکر کرنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں بوڑھی عورتیں اوّل رہتی ہیں ۔ان کی زبان پر ہمیشہ یہ کلمات رہتے ہی ہیں فلاں کی بچّی جلدی سیج چڑھ جائے، مطلب یہ کے شادی جلدی ہو جائیں۔

☆ **کنگھی چوٹی**۔۔۔ بناؤ سنگھار، زیبائش آرائش جو عورتوں کا شوق اور ان کی ضرورت ہوتی ہے، اسی کو 'کنگھی چوٹی' کہتے ہیں۔ اس کا تعلق خاص ہندوستانی معاشرے سے ہے۔

☆ **گھونگھٹ کھولنا، گھونگھٹ اٹھانا**۔۔۔ ہندوستانی تہذیب میں جب عورتیں شادی کے بعد اپنی سسرال جاتی تھیں تو دلھن کے چہرے پر ایک لمبا سا خوبصورت دوپٹہ پڑا رہتا تھا۔ یہ دوپٹہ منھ دکھائی کی رسم کے موقع پر اٹھایا جاتا تھا (یہ رسم آج بھی رائج ہے)۔ دولھا جب اپنی دلھن کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے تو۔ اسے 'گھونگھٹ اٹھانا' کہتے ہیں۔

☆ **لٹوریوں والی**۔۔۔ ایسی عورت یا لڑکی جس کے بال کھلے رہیں اور لٹوں کی شکل میں بکھرے رہیں۔ اسے لٹوریوں والی کہا جاتا ہے۔ اس سے لڑکی کا لاابالی پن مقصود ہے نا کہ طنز یا ناپسندیدگی۔

☆ **مرد کی صورت نہ دیکھنا**۔۔۔ جو عورت یا لڑکی انتہائی پاکیزہ کردار ہوتی ہے اس عورت کے لیے کہا جاتا ہے کہ فلاں نے 'مرد کی صورت بھی نہیں دیکھی'۔ (یہاں مرد سے مراد شوہر ہے) ورنہ مرد باپ اور بھائی بھی ہو سکتے ہیں۔

کہاوتیں:

☆ **دام کرے کام، بی بی کرے سلام**۔۔۔ ہندوستانی سماج میں عورت مرد کی تابعدار ہو کر رہ گئی اور معاشی اعتبار سے بھی اسے مردوں کی دست نگر ہونا پڑا۔ لیکن سماج نے اس کی مجبوری اور بے بسی کو سمجھنے کے بجائے اس کی معاشی حالت کا مذاق اڑایا اور 'دام کرے کام، بی بی کرے سلام' کہہ کر اس پر طنز کیا۔

☆ **کمائے ایک سودس، ساس نند کو چھوڑ دو ہمیں تمھیں بس**۔۔۔ جو عورتیں اپنے میاں کو لے کر گھر سے الگ ہو جاتی ہیں اسے اس کہاوت کے ذریعے بتایا گیا ہے۔

☆ **ماں ٹٹولے پیٹ، بیوی ٹٹولے پھینٹ**۔۔۔ مرد جب دن بھر کا تھکا ہارا گھر لوٹتا ہے تو ماں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ بیٹے نے کچھ کھایا کہ نہیں، اور بیوی کو یہ فکر ہوتی ہے کہ مرد نے کچھ کمایا کہ نہیں۔

☆ **اونٹ کی پکڑ اور عورت کی مکر سے خدا بچائے**۔۔۔ سماج میں ایسے بہت سے مرد ہیں جن کو اپنی بیوی میں کھوٹ نظر آتی ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اسی طرح بیوی بھی اپنے منصب اور ماحول کے مطابق کبھی حکمتِ عملی، کبھی چالاکی، اور کبھی نرمی گرمی سے کام

لیتی ہے۔اس کے اس طرزِ عمل کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

☆ **تم کاٹو ناک یا کان، میں نہ چھوڑوں اپنی بان۔۔۔**عورت جتنی سمجھ بوجھ رکھتی ہے اتنی ہی اس کی ضد اور ہٹ دھرمی بھی مشہور ہے۔ اس کہاوت میں عورت کے مزاج کی ترجمانی خود اس کی زبانی کی گئی ہے۔

☆ **'جسے پیا چاہیں وہ سہاگن۔'**ہندوستانی معاشرے میں عورت کا وجود مرد کے بغیر ادھورا ہے۔عورت معاشرے میں اسی وقت عزّت پاتی ہے جب وہ اپنے مرد کی توجہ اور محبت سے سرخ رَو ہو۔

☆ **'تریا روئے پرکھ بنا، کھیتی روئے ہرک بنا۔۔'** مرد اور عورت کے رشتے کی ترجمانی اس کہاوت میں ملتی ہے جس طرح ساون بنا کھیتی سوکھی ہے، اسی طرح مرد بنا عورت۔پھر چاہے وہ مرد کام چور، نکھٹو، تیز مزاج ہی کیوں نہ ہو۔اس کے بنا عورت کی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ **'سونی سیج سے مرکھنا بیل اچھا'**

☆ **تین دن قبر میں بھی بھاری ہوتے ہیں۔۔۔**عورت کو اپنے بے آبرو ہونے کا خطرہ قبر میں بھی ہوتا ہے۔

☆ **بانجھ اچھی اکو انجھ بری۔۔**اکلوتی اولاد اگر نالائق، نکّمی، نکل جائے تو وہ مستقل عذاب بن جاتی ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ عورت بانجھ رہے تو اچھا ہے۔

☆ **بیوی کو باندی کہو، ہنس دے**
باندی کو باندی کہو، جل مرے

ہماری تہذیب میں عورت کو بہت صابر و شاکر بتایا گیا ہے۔مرد عورت کو جو چاہے کہہ لے وہ برا نہیں مانتی، اگر گالی بھی دے دے تو بیوی ہنس کر ٹال دیتی ہے۔وہی اگر باندی کو باندی کہا جائے تو وہ برا مان جاتی ہے۔

☆ **پھوہڑ چلے سو گھر ہلے۔۔**جو عورتیں پیر پٹک کر چلتی ہیں ان کی چال ڈھال سے پھوہڑ پن نظر آتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں عورت بیٹی، بیوی، ماں ان منزلوں سے گذرتی ہے۔ان منزلوں سے گزرتے ہوئے اسے کئی طرح کے طعنے دیے جاتے ہیں۔جیسے جب تک بہو گھر میں بیاہ کر کے نہیں آ جاتی اس کی ہر بات ساس کو اچھی لگتی ہے۔کیونکہ وہ اس کا چناؤ ہوتی ہے، لیکن جب وہ گھر میں اور اس کے معاملات میں دخیل ہو جاتی ہے تو ساس کو اس میں سو برائیاں نظر آتی ہے۔

☆ **بہو رہی کنواری، ساس گئی واری**
بہو آئی بیاہی، پڑ گئی خواری

☆ **بیاہی لڑکی پڑوسن داخل۔۔۔** ہماری تہذیب میں جب لڑکی بیاہی جاتی ہے تو وہ ماں باپ کے لیے پرائی بن جاتی ہے۔یہ ہندوستانی سماج کا ایک پہلو ہے۔

☆ **دھی سے کہے، بہو نے کان کئے۔۔** ساس اور بہو کے رشتے کو زمانہ قدیم سے ہی بڑی اہمیت حاصل ہے۔دونوں کے درمیان رسا کشی رہتی ہے۔جب ساس بہو کی بجائے بیٹی کو شا کر مان کر بہو پر تنقید کرتی ہے، تو بہو بہت محتاط ہو جاتی ہے۔اس کی اس حالت کو بیان کیا گیا ہے۔اسی طرح بہو کے گھر والے جب جہیز نہیں دیتے تو یہ طنز کیا جاتا ہے،

پھلتی لگی نہ پاپڑی، ٹپاک بہو آ پڑی 'بہو بیچاری کو ساس کے ساتھ سات نند کے بھی طعنے سننا پڑتے ہیں، لیکن جب پانی سر سے اوپر ہو جاتا ہے تب بھابھی نند کو روکتے ہوئے کہتی ہے، **مت کر نند برائی، تو بھی کسی کی بھو جائی۔**

☆ **چار دن ساس کے تو چار دن بہو کے۔۔** ساس کی عمر جب ڈھل جاتی ہے اور وہ ہر بات کے لیے بہو پر منحصر ہوتی ہے، تب "چار دن ساس کے اور چار دن بہو کے کہا جاتا ہے۔اتنا ہی نہیں، **'ساس کا اوڑھنا، بہو کا بچھونا'** بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ 'مائی جی کی تھان کھیلے چوگان'، 'بڑی بہو نے نکالے کار، وہی اترے پارم پار'، لڑی فوج، نام سردار کا، گھی کرے کام بڑی بہو کا نام، ساس نہ نندی آپ ہی آنندی، آنکھ میں تھی شرم، دل کی تھی نرم، آنکھ نہ ناک بنّو چاند کی سی، آئیں بیوی عاقلہ، سب کاموں میں داخلہ، اب ستونتی ہو کر بیٹھی لوٹ کھایا سنسار'، 'البیلی نے پکائے کھیر، دودھ کی جگہ ڈالا نیر'، 'بڈھی گھوڑی لال لگام'، 'بیوی خیلا، ایک اجلا ایک میلا'، 'بھیڑ کی لات کیا، عورت کی بات کیا'، 'اٹھو چندہ تجھے وہی دھندا'، 'تو بھی رانی میں بھی رانی، کون بھرے پنگھٹ پر پانی' وغیرہ عورت سے منسوب محاورات اور کہاوتیں اردو زبان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان میں یہ موجود ہیں جن سے ادب معطر ہو رہا ہے۔

❑❑❑

Mr. Firdaus Anjum Shaikh Aasif
K.G.N Dairy, Ward No. 6
Iqbal Nagar
Buldhana-443001 (Maharashtra)
Mobile: 9960922510

جہانِ نسواں

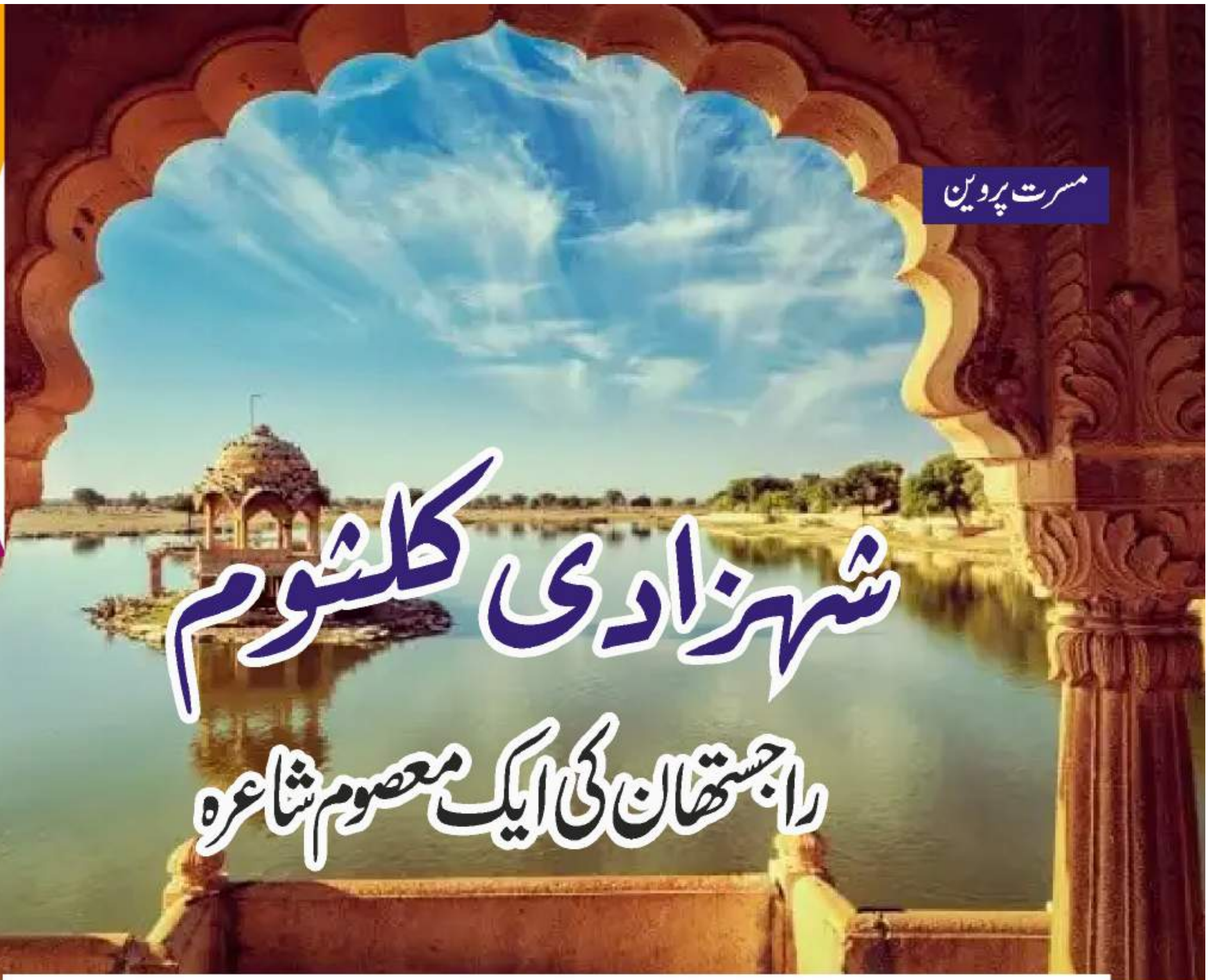

مسرت پروین

شہزادی کلثوم

راجستھان کی ایک معصوم شاعرہ

راجستھان کے شعر و ادب میں خواتین نے بھی وقتاً فوقتاً اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ صالحہ بیگم پروین (جے پور، 1866۔ 1944)راجستھان کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہیں۔ان کا دیوان 1915 میں جے پور کے مطبع سراج الفیض سے شائع ہوا تھا۔ پروین کی ہی ہم عصر ایک اور شاعر تھیں ''شہزادی کلثوم''۔جو 1928 میں جے پور میں پیدا ہوئیں اور 1949 میں صرف بیس سال کی عمر میں شری نگر، کشمیر میں انتقال کیا۔اس شاعرہ کا کلام اس کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا تھا۔

کلثوم کے انتقال کے بعد ان کے بھائی اکبر جے پوری نے 1963 میں ان کا مجموعۂ کلام ''یادگارِ کلثوم'' کے نام سے 1963 میں نذیر جان پبلی کیشنز، بابا پورہ، سری نگر سے شائع کیا۔ پروین کے بعد شہزادی کلثوم دوسری صاحبِ دیوان شاعرہ ہیں۔راجستھان کے لوگ اس مجموعہ سے واقف نہیں تھے۔اس مجموعہ سے سب سے پہلے شاہد احمد جمالی نے 1914 میں اپنی کتاب ''چند شاعراتِ راجستھان'' کے ذریعہ متعارف کرایا۔نہ صرف متعارف کرایا بلکہ کلثوم کے کلام کا نمونہ اور اس کے حالات زندگی بھی درج کیے۔تب راجستھان کے اہل قلم حضرات کو پتہ چلا کہ جے پور میں ایک کمسن شاعرہ ایسی بھی ہوئی ہے جس نے، آزادی کے گیت گنگنائے، سلام، نوحہ، غزل، اور نظم پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

کلثوم جے پور میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں 1928 میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید علی کشمیری اہل سادات کے دیندار بزرگ تھے۔دستور کے مطابق آپ کی تعلیم وتربیت ہوئی۔

اس زمانے میں ہندوستان کے حالات ہنگامی تھے۔ ہر جگہ ایک تحریک تھی اور انگریزی حکمرانوں کے خلاف عوام میں غم وغصہ تھا۔1938 میں کل ہند خاکساروں کا اجتماع جے پور میں منعقد ہوا تھا۔اس وقت کلثوم صرف 10 سال کی تھیں لیکن اس اجتماع کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور تقاریر سنی تھیں۔ یہیں سے ان کے ذہن میں قومی جذبہ نے سر ابھارا اور قوم کے تعمیری مستقبل کا خواب دیکھنے لگیں۔ جلد ہی ان کے اندر چھپی ہوئی شاعرہ باہر آ گئی۔نہایت موزوں شعر کہنے لگیں۔18 سال کی عمر تک آتے آتے بہت سی غزلیں۔ سلام، منقبت، مرثیے، نظمیں لکھ ڈالیں۔ ان کی شاعری میں جا بجا قوم کی ترقی کا جذبہ نظر آتا ہے۔

1947 میں آپ بیمار ہوئیں۔ جب طبیعت سنبھل نہ سکی تو کشمیر

کے شہر شری نگر اپنے بھائی کے ہمراہ چلی گئیں۔ یہ شہر آپ کے بزرگوں کا قدیم شہر ہے۔ یہاں کی آب وہوا میں معمولی راحت ملی۔ دوسال کے اندر بیماری کی ہی حالت میں عین عالم شباب میں 20 رسال کی عمر پاکر 1949 میں وادیٔ کشمیر میں انتقال کیا۔

(چند شاعرات راجستھان اور کچھ بھولے بسرے شعراء۔شاہد احمد جمالی۔ناشر،فائز احمد، جے پور۔2014۔ص۔33۔34)

شہزادی کلثوم کو پریشانی کی حالت میں جے پور چھوڑنا پڑا تھا، جس کا ذکر انھوں نے اپنی نظم، ''اپنا ماضی وحال'' میں کیا ہے، ملاحظہ کیجئے،

آہ اب تک بھی مجھے اپنی کہانی یاد ہے
جب خدا کی ہر طرح تھی مہربانی یاد ہے
آہ جے پور کی زمین بھی شہرہ آفاق تھی
یاد آتا ہے کہ جب بستی گل و گلزار تھی
ہم جہاں جاتے تھے عزت آئینہ بردار تھی
اس سرے سے اس سرے تک تھی مکانوں کی قطار
اللہ اللہ وہ مکیں تھے جن کے چہرے نور بار
گوشہ گوشہ غیرتِ صد خطّہ کشمیر تھا
ہم کو تو جے پور ہی جنت کی اک تصویر تھا

....

اب نہ کوئی کوٹھی ہے نہ بنگلہ نہ پائیں باغ ہے
دامنِ گلشن پہ مرجھایا ہوا گلِ داغ ہے
تنگ ہم پر یہ زمیں ہے آسماں ہے تاک میں
ہو گیا جینا اجیرن، آگیا دم ناک میں

(یادگار کلثوم۔ص۔144۔145)

شہزادی کلثوم نے نظم اور غزل کے علاوہ سلام گوئی میں کافی طبع آزمائی کی ہے۔غزل میں ان کے یہاں مضامین کی کمی نہیں ہے، خیالات کی فراوانی، نشستِ الفاظ اور سلاست اس کے کلام کی خوبی ہے۔اسی طرح نغمگی اور موسیقیت عام طور پر نظر آتی ہے، غزل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں،

آرہی ہے میری آنکھوں میں سمٹ کر کائنات
خواب پورا ہو چکا اب وقت ہے تعبیر کا
نکلا نہ بعدِ مرگ بھی سینے سے تیرِ ناز
دل میں اِدھر چبھا اُدھر ارمان ہوگیا

ذرا ان معصوم اور پاکیزہ خیالات کو بھی ملاحظہ کریں،

سر اٹھا تھا ابھی نہ سجدے سے
سامنے ان کا آستانہ تھا
برق بھی باغ میں وہیں پہ گری
جس جگہ میرا آشیانہ تھا

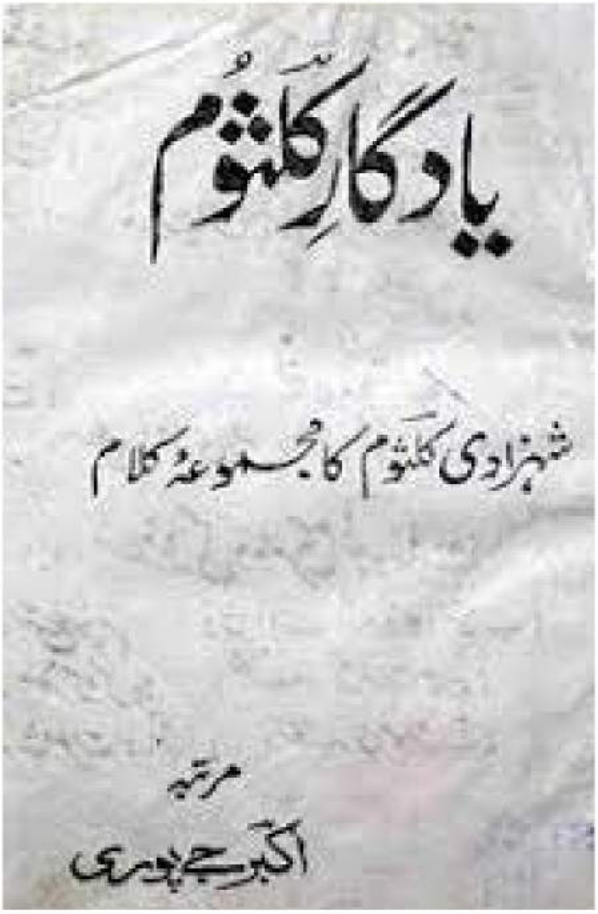

شہزادی کلثوم کے اشعار میں تغزل کی کمی نہیں ہے۔اس قدر چھوٹی سی عمر اور کم وقت میں اپنے اشعار میں تغزل پیدا کرنا واقعی خداداد صلاحیت پر منحصر ہے۔غزل کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

جب اہل دل کو عشق کا عرفاں ہوگیا
حسنِ فریب کار پشیماں ہوگیا

(شہزادی کلثوم اور اس کی شاعری۔ڈاکٹر شاہد احمد۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔2019۔ص،12۔13)

شہزادی کلثوم اپنے اندر ایک دردمند دل رکھتی تھیں، انھوں نے انگریزی حکومت کے دور میں آنکھیں کھولی تھیں، انگریزوں کا ظلم وستم بھی دیکھا تھا، وطن کی آزادی کے گیت بھی سنے تھے، پھر بھلا وہ ان سب سے متاثر کیوں نہیں ہوتیں، ''برادرانِ وطن'' سے خطاب میں شہزادی کلثوم کہتی ہیں:

ملک کی حالت پہ سینوں سے دُھواں اٹھتا نہیں
سازِ دل خاموش میں شُور فغاں اٹھتا نہیں
کس لیے آنکھوں میں طوفان نہاں اٹھتا نہیں
پھول روندے جا رہے ہیں باغباں اٹھتا نہیں
مطمئن بیٹھے ہو دل سینے میں گھبراتا نہیں
قوم کے دم توڑنے پر بھی ترس آتا نہیں

مسلم قوم کا شاندار ماضی اور موجودہ زوال پر کلثوم نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے، ''صدائے دل'' نظم سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں،

خدایا دور کر ارباب ملت کی پریشانی
الٰہی کارِ مشکل میں دکھادے مشکل آسانی

اسی طرح ''خونِ مسلم''، ''احساسِ زوال''، ''انقلابِ فلسطین'' بھی اسی قبیل کی نظمیں ہیں، ''انقلابِ فلسطین'' سے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے،

نام کو باقی نہیں اسلام کا عزّو وقار
تیری آنکھوں سے مگر جاتا نہیں اب تک خمار
ہوک اٹھتی ہے یہ سن کر مرے دلِ ناکام میں
پلٹنیں کفّار کی ہوں خانۂ اسلام میں

شہزادی کلثوم نے منقبت اور سلام میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے اس مجموعہ کلام میں پہلا سلام شیر خدا حضرت علیؓ کی شان میں ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کی پیدائش (مولود کعبہ) کا ذکر کیا ہے۔

سلام:

راکب دوشِ محمد، زینت بیت الحرام
حیدر وصفدر علی شاہنشاہ عالی مقام
ہے تصور دل میں اب مولیٰ علی کا صبح وشام
کھینچ لی میں نے اس آئینہ پہ تصویر دوام
آرہا ہے کون ایسا خاصہ رب الانام
اے مہ نور ہو رہے ہیں کس کو جھک جھک کر سلام
مژدہ بادائے مومنو قبلہ نما پیدا ہوا
ہو مبارک زچخانہ بن گیا بیت الحرام
کعبہ میں نازل ہوا قرآنِ ناطق عرش سے
کعبہ میں پیدا ہوا وہ خاصہ رب الانام
بو الحسن، زوج بتول، اور خاص داماد رسول
یعنی سلطانِ عربؐ، شاہ نجف، کل کا امام
دل میں ہے کلثوم روشن نام مولای علی
ہے میرا سارا اثاثہ ایک یہ نقش دوام

مخدومۂ عالم (حضرت فاطمہ)

خاتون خلد بنت پیمبر ہیں فاطمہ
نور خدا ہیں زوجہ حیدر ہیں فاطمہ
رتبہ میں فخر مریم وحوا، بتول ہیں
ارض وسما کا نور یہ دخترِ رسول ہیں
پیارے نبی کی آنکھ کا تارا تھیں نور تھیں
ایمان وآگہی کا مقصد ظہور تھیں
حوروملک ہیں تابع فرمان فاطمہ
پیغمبر زماں ہیں ثنا خواں فاطمہ
آتی تھیں جب حضورؐ کی تسلیم کے لیے
اٹھتے تھے خود رسول بھی تعظیم کے لیے

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہزادی کلثوم ایک بہترین شاعرہ تھی، بہت کم عمری میں ان کا انتقال ہوگیا، ورنہ آج ان کی شاعری ملکی سطح پر اپنا لوہا منوا رہی ہوتی۔ آخر میں ''محبت'' نامی نظم سے تین اشعار پیش کر رہی ہوں۔

کبھی ہم نے دشمن کو دشمن نہ جانا
خدا پر ہے روشن ہماری محبت
لگاؤ ذرا بھی ہو اگر اس میں
تو پھر جامِ سم ہے یہ پیاری محبت
وہی خون ہم میں وہی خون تم میں
ہے جس کے سبب پیاری پیاری محبت

☆☆☆

ماخذ:

1۔ یادگار کلثوم۔مرتبہ۔اکبر جے پوری۔شری نگر کشمیر۔1963
2۔ چند شاعرات راجستھان اور کچھ بھولے بسرے شعراء۔شاہد احمد جمالی۔2014۔جے پور
3۔ شہزادی کلثوم اور اس کی شاعری۔ڈاکٹر شاہد احمد۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔2019 □□□

Ms. Masarrat Parween
Research scholar
Dept. of Urdu & Persian
University of Rajasthan
Jaipur-302004 (Rajasthan)

شاذیہ زرّیں

خواتین فرہنگ نویس کی فرہنگوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

ایک زمانہ تھا جب مشرقی تہذیب کی پروردہ خواتین بعض رسوم و قیود کے سبب گھر کی چہار دیواری ہی میں محسور ہو کر رہ گئی تھیں۔ صلاحیت کے باوجود شعری اور نثری اصناف کی طرف ان کا متوجہ ہونا تو دور کی بات تھی، اُن کی شناخت کو بھی معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ بعض خواتین تو اپنے اصلی نام کے بجائے فرضی نام سے اخبارات و رسائل میں نہایت راز داری کے ساتھ اپنی نگارشات شائع کرانے کے لیے مجبور تھیں۔ رام پور رضا لائبریری میں محفوظ اخبارات و رسائل میں بعض خواتین قلم کاروں کی نگارشات میں کچھ اس طرح سے نام تحریر ہیں: مسز صولت خاں، مسز عاصف علی، والدہ شبّن میاں، بیگم مجاہد خاں وغیرہ۔

سماجی تبدیلیوں، اصلاحی تحریکوں اور جدید تعلیم کے سبب بعض خواتین میں رفتہ رفتہ جرأت و ہمّت کے عناصر نمودار ہونے لگے۔ انھوں نے جرأتِ نسواں کا مظاہرہ کرتے ہوئے زندگی کے مختلف شعبوں میں نہ صرف اپنے قدم جمانے شروع کر دیے بلکہ وہ ادب کی مختلف اصناف کی طرف بھی متوجہ ہونے لگیں۔ شعر و شاعری ہو یا افسانوی ادب، غیر افسانوی ادب ہو یا علوم و فنون کے دیگر شعبۂ جات، عہدِ حاضر میں خواتین کی نمائندگی تقریباً ہر جگہ نظر آ رہی ہے۔ شعر و شاعری اور افسانوی ادب کی بہ نسبت اگرچہ لغت نگاری اور فرہنگ نویسی جیسے دیدہ ریز اور دقّت طلب کام کی طرف خواتین کا رجحان کم نظر آتا ہے لیکن اپنے ذاتی ذوق اور یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے مقصد سے جن خواتین نے ادباء و شعراء اور دیگر موضوعات کے تعلّق سے چند فرہنگیں مرتّب کی ہیں ان میں فہمیدہ بیگم، وحیدہ نسیم، شاہینہ تبسّم، نعیمہ پاشا، ساجدہ قریشی، اسماء عزیز، زیبا ناز، ملکہ بیگم اور رخسانہ بیگم کے نام ہی نظر آتے ہیں۔

خواتین کی زبان سے متعلق وحیدہ نسیم کی مرتب کردہ فرہنگ کا نام ''نسوانی محاورے'' ہے جو 1982 میں شائع ہوئی تھی۔ اس فرہنگ کے آغاز میں ایک صفحہ پر جلی حروف میں درج ذیل عبارت تحریر ہے:

''اُن تمام کہاوتوں اور محاوروں کی لغت جو روزمرّہ بول چال میں ہندوستانی خواتین استعمال کرتی ہیں۔''

اس لغت یا فرہنگ کے نام اور مندرج تحریر میں واضح تضاد ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ ''نسوانی محاورات'' کی فرہنگ ہے اور درج بالا تحریر کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ ''نسوانی کہاوتوں اور

محاوروں'' کی فرہنگ ہے۔ دراصل اس فرہنگ میں خواتین کی زبان کے تعلق سے محاوروں کی بھی شمولیت ہے اور دیگر الفاظ کی بھی مثلاً آپے سے باہر ہونا، خون پانی ایک کرنا، منہ چڑھ جانا، میدان داری کرنا، مَیل کا بَیل بنانا محاورات ہیں۔ آپادھاپی، پنجیری، پنڈا، خدا سمجھے، خصماں پٹی، خیلا، ڈولی، رخصتی، مَوت پڑے، موری کا کیڑا، موم کی مریم، میٹھا برس اور ناشدنی جیسے سینکڑوں الفاظ نہ کہاوتیں ہیں اور نہ محاورے بلکہ وہ مخصوص الفاظ ہیں جنھیں اکثر عورتیں ہی استعمال کرتی ہیں۔

وحیدہ نسیم کی دوسری فرہنگ کا نام ''لغات النساء'' ہے جو 1987 میں شائع ہوئی تھی۔ ''لغات النساء'' اور ''نسوانی محاورے'' میں نام کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک ''لغات النساء'' میں اُن ہی تمام الفاظ کے وہی معانی تحریر کیے گئے ہیں جن کا اندراج ''نسوانی محاورے'' میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ''نسوانی محاورے'' میں درج تمام الفاظ محاورے کی تعریف میں نہیں آتے ہیں اس لیے اس کتاب کا نام ''نسوانی محاورے'' کے بجائے ''لغات النساء'' کردیا گیا۔

میر تقی میر کے دیوانِ اوّل پر مبنی شاہینہ تبسّم کی مرتّب کردہ فرہنگ کا نام ''فرہنگِ کلامِ میر مع تنقیدی مقدّمہ'' ہے۔ یہ فرہنگ 1993 میں شائع ہوئی تھی۔ فرہنگ سے قبل مقدّمہ کے ذریعہ مختصر طور پر لغت اور فرہنگ کے باہمی فرق کی وضاحت کے علاوہ میر کی شاعرانہ عظمت، میر کے لسانی رویّے، کلامِ میر میں تَت سَم اور تَدبھَو الفاظ، فارسی کے مرکّب الفاظ و تراکیب، کلامِ میر کے متروک الفاظ، فچائیوں کے فنکارانہ استعمال وغیرہ کی مع مثال نشان دہی کی گئی ہے۔ اس فرہنگ کی فہرست نہایت ناقص ہے۔ فہرست کو ''مندرجات'' کا عنوان دیا گیا ہے مگر شروع کے چار اور آخر کے دو عنوانات کے سامنے تو صفحات نمبر کا اندراج ہے، باقی تمام عنوانات صفحات نمبر کے بغیر تحریر کیے گئے ہیں۔ اندرونی صفحات میں وہ عنوانات بھی قائم نہیں کیے گئے ہیں جن کا اندراج فہرست میں ہے۔

مذکورہ فرہنگ حروفِ تہجّی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔ الفاظ کے معانی تحریر کرنے کے بعد بطورِ سند دیوانِ میر حصّہ اوّل سے اخذ کیے گئے اُس شعر کو درج کیا گیا ہے جس میں معنی طلب لفظ کی شمولیت ہے۔ تمام الفاظ کے معانی کس لغت یا فرہنگ سے اخذ کیے گئے ہیں یا شعر کے مفہوم کے اعتبار سے تحریر کیے گئے ہیں، اس کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے اور یہ بھی واضح نہیں کیا گیا ہے کہ بطورِ سند تحریر کیا گیا شعر دیوانِ میر حصّہ اوّل کے کس صفحہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس فرہنگ میں اُن الفاظ کے معانی بھی کثیر تعداد میں تحریر کیے گئے ہیں جو عام کتبِ لغت میں بہ آسانی مل جاتے ہیں یا جنھیں میر تقی میر نے لغوی معنی ہی میں استعمال کیے ہیں جیسے زاہد، ذرّہ، ذقن، تجاہل، تحمّل، مستعار، بار، استغنا، کیوں کہ، گور، دید، نزع، منقار، شیطان، شیفتہ، سپہر وغیرہ۔ ایک ہی لفظ کو سابقوں یا لاحقوں کے ساتھ لکھ کر معانی کی تکرار بھی اصولِ فرہنگ نویسی کے خلاف ہے مثلاً تجھ حُسن، تجھ رو، تجھ ہجر میں کے معانی تیرے حُسن، تیرے چہرے کو، تیرے فراق میں اور لبِ دریا، لبِ گور کے معانی دریا کا کنارہ، قبر کے کنارے تحریر کیے گئے ہیں۔

نعیمہ پاشا کی مرتّب کردہ فرہنگ کا نام ''فرہنگِ کلّیاتِ نظیر اکبرآبادی مع تنقیدی مقدّمہ'' ہے جس کا سنہ اشاعت 2000 ہے۔ اس فرہنگ کو مرتّب کرنے کے لیے عبدالغفور شہباز کی مرتّب کردہ کلّیاتِ نظیر اکبرآبادی، مطبع نول کشور پریس 1900ء کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

مذکورہ فرہنگ میں لغت نویسی کے فن، لفظ کے ماخذ، لغت اور فرہنگ کے فرق کو واضح کرنے کے علاوہ فرہنگِ نظیر کی ضرورت اور اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی مقدّمہ کے ضمنی عنوانات کے تحت نظیر کے دور کے سیاسی وسماجی حالات، نظیر کے حالاتِ زندگی، مشاغل اور شاعری کی اہم خصوصیات کا ذکر بھی مختصر طور پر کیا گیا ہے۔ فرہنگ کے اندرونی صفحات پر جو عنوانات تحریر کیے گئے ہیں ان میں اور فہرست کے عنوانات میں نمایاں فرق ہے اور بعض عنوانات کا فہرست میں اندراج بھی نہیں ہے جیسے حروفِ تہجّی کے اعتبار سے الفاظ کی ترتیب، لفظ کا ماخذ، تلفّظ، گرامر، فرہنگ میں شامل الفاظ کے معنی اور مطالب کا ماخذ۔

فہرست نہ صرف صفحات نمبر سے مبرّا ہے بلکہ اندرونی صفحات اور فہرست کے عنوانات میں بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے جیسے فہرست میں ''زبان کی قسم'' اور اندرونی صفحہ پر ''زبان اور بولی''۔ فہرست میں ''نظیر کے دَور کے سیاسی اور معاشی حالات اور نظیر پر ان کا اثر''۔ اندرونی صفحہ پر ''نظیر: حالاتِ زندگی اور میلانِ طبع، ان کی شخصیت، مشاغل اور شاعری پر اس کے اثرات'' کا اندراج ہے۔ اسی طرح دیگر عنوانات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ تمام الفاظ، محاورات، اصطلاحات وغیرہ کے معانی یا مفاہیم لکھنے کے بعد کلّیاتِ نظیر اکبرآبادی سے اخذ کیے گئے اس شعر یا مصرع کو مع صفحہ نمبر بھی درج کیا گیا ہے جس میں معنی طلب لفظ کی شمولیت ہے۔ فرہنگ میں ایسے الفاظ کو بھی کثیر تعداد میں شامل کیا گیا ہے جن کے معانی یا مفاہیم لکھنے کے بجائے قدیم کتبِ لغت کی تقلید کرتے ہوئے ایک پرند کا نام، ایک جانور کا نام وغیرہ لکھ کر اکتفا کرلیا گیا ہے جیسے دہیڑ: ایک قسم کی چڑیا، جُگت: شاعری کی ایک قسم، ساڑو: ایک سیاہ رنگ کی چڑیا۔ اس فرہنگ میں اُن

عام الفاظ کی بھی شمولیت ہے جنھیں نظیر نے لغوی معانی ہی میں استعمال کیا ہے مثلاً آندھی، داور، دشنام، راستی، ساجد، ساعت، سود، طبیب، طراوت، طبابت فربہ، مکر۔ فرہنگ میں اس قسم کے الفاظ کی شمولیت فنِ فرہنگ نویسی کے منافی ہے۔

فرہنگِ کلّیاتِ اقبال (اُردو) رخسانہ بیگم کا تحقیقی مقالہ ہے جو 2010 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس فرہنگ کے مقدّمہ میں فرہنگ کی اہمیت، تعریف، ہیئت، فرہنگ اور لغت میں فرق اور اقسامِ فرہنگ کی وضاحت بھی کی گئی ہے اور فرہنگ نویسی کے ارتقاء اور فرہنگِ کلّیاتِ اقبال کی اہمیت وضرورت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ فرہنگ بھی دیگر فرہنگوں کی طرح بہ اعتبارِ حروفِ تہجّی مرتّب کی گئی ہے۔ ہر لفظ کے معنی لکھنے کے بعد قوسین میں اس لغت یا فرہنگ کے مخفّف کا اندراج کیا گیا ہے جہاں سے معنی اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اقبال کے اس شعر کو نقل کیا گیا ہے جس میں متعلقہ لفظ کو نظم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قوسین میں نظم کے عنوان کے ساتھ اقبال کے مجموعۂ کلام کا مخفف اور صفحہ نمبر کا اندراج ہے۔

اقبال فہمی اور اقبال شناسی کے اعتبار سے یہ فرہنگ اہمیت کی حامل ہے مگر آب، جدا، ساعت، ساقی، حباب، حجاب، حجر، قطار، لاغر، یگانہ جیسے عام فہم اور لغوی معانی میں استعمال کیے گئے الفاظ کا فرہنگ میں شامل کیا جانا کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں۔

فرہنگِ کُلّیاتِ انشاء ساجدہ قریشی کا تحقیقی مقالہ ہے جو اُنھوں نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے قلم بند کیا ہے۔ اس فرہنگ کو مرتّب کرنے کے لیے کُلّیاتِ اِنشاء اللہ خاں، مطبوعہ مُنشی نوَل کشور پریس، لکھنوَ 1876 کو بنیاد بنایا ہے اور بطورِ حوالہ اسی کُلّیات کے صفحات نمبر وغیرہ کا اندراج کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا محمد عسکری ومحمد رفیع کے مرتّب کردہ ''کلامِ اِنشاء'' مطبوعہ 1952 سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کُلّیاتِ اِنشاء (مطبوعہ مُنشی نول کشور پریس) میں اِنشاء کا جو کلام شامل نہیں ہے اور وہ کسی دوسرے نسخوں، لغات اور فرہنگوں میں نظر آیا ہے اُسے بھی حوالہ کے ساتھ شاملِ فرہنگ کرلیا ہے یعنی کُلّیاتِ اِنشاء (مطبوعہ مُنشی نول کشور پریس) کے علاوہ اِنشاء کے کلام کے دیگر مجموعوں اور مختلف کتابوں میں بکھرے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے اخذ کیے گئے تمام معانی، مطالب اور مفاہیم کو اسناد وشواہد کے ساتھ درجِ فرہنگ کیا ہے۔ عربی اور فارسی زبانوں کے مشکل اور دقیق اور مفرّدات ومرکّبات کو طلباء وغیرہ کی آسانی اور ضرورت کے پیشِ نظر شامل کیا ہے مگر ان زبانوں کے آسان اور عام فہم مفرّدات ومرکّبات کو اس لیے نظر انداز کردیا ہے کہ وہ اُردو، عربی اور فارسی زبانوں کی عام لغات اور فرہنگوں میں آسانی سے دستیاب ہوجاتے ہیں۔

اس فرہنگ کا اندازِ ترتیب یہ ہے کہ حروفِ تہجّی کے اعتبار سے الفاظ لکھنے کے بعد نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ الفاظ کس زبان کے ہیں۔ اس کے بعد اُن کے معنی یا مفاہیم لکھے گئے ہیں اور اُس کتابِ لغات یا فرہنگ کا مخفف نام تحریر کیا گیا ہے جہاں سے اُس کے معنی یا مفاہیم اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد کُلّیاتِ انشاء سے اُس شعر کو مع صفحہ نمبر درج کیا گیا ہے جس کے معانی ومفاہیم لکھے گئے ہیں۔ اس طرح کوئی بھی قاری کُلّیاتِ انشاء میں اُس شعر کو بہ آسانی تلاش کرسکتا ہے جس کے معانی درج کئے گئے ہیں۔

فرہنگ کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بابِ اوّل میں لغت اور فرہنگ کا فرق و امتیاز، اُردو میں فرہنگ نویسی۔ بابِ دوم میں شعری زبان کے مطالعہ کی اہمیت اور انشاء کے کلام کی خصوصیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بابِ سوم میں فرہنگِ کُلّیاتِ انشاء کی ضرورت واہمیت اور فرہنگ کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس فرہنگ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کلامِ انشاء سے بعض ادبی اور معلوماتی الفاظ واشیاء کی درجہ بندی بھی کی گئی ہے اور آخر میں قدیم یا وضاحت طلب اشیاء کی تصاویر بھی دے دی گئی ہیں تاکہ قاری بہ آسانی وضاحت طلب اشیاء کو سمجھ سکے۔ یہ فرہنگ نہ صرف کلامِ انشاء اور اُن کے عہد کے دیگر شعراء کے کلام کو سمجھنے میں معاون ہوگی بلکہ عہدِ انشاء کی معاشرت کو بھی سمجھنے میں مددگار ہوگی۔

فرہنگِ کُلّیاتِ سَودا اسماء عزیز کا تحقیقی مقالہ ہے جو 2012 میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ سَودا کے کلام کو سمجھنے اور عہدِ سَودا کی معاشرت وثقافت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے کلامِ سَودا کی فرہنگ کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

کسی بھی شاعر یا ادیب کی نگارش میں پائے جانے والے تمام الفاظ کا اندراج فرہنگ میں نہیں کیا جاتا ہے۔ اُس کی تحریر سے وہی الفاظ اخذ کئے جاتے ہیں جو لغوی معانی سے جدا ہوں یا کسی نہ کسی طرح معنوی توسیع کے حامل ہوں۔ فرہنگ میں شامل اندراجات کے تمام متوقع قدیم وجدید معانی کے بجائے وہی معنی یا مفہوم تحریر کیے جاتے ہیں جس کے لیے اُنھیں مخصوص طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ خود مرتّبہ نے زیرِ نظر فرہنگ کے مقدّمہ میں تحریر کیا ہے :

''......فرہنگ اور لغت کے دائرۂ کار میں نمایاں فرق ہے۔
عام طور پر لغت میں تمام الفاظ قدیم وجدید، مستعمل ومتروک
سب کو شامل کرلیا جاتا ہے اور الفاظ کے معنی لکھ دئے جاتے

ہیں اور کبھی کبھی تلفّظ کی نشان دہی بھی کر دی جاتی ہے جب کہ فرہنگ میں شامل ہونے والے الفاظ میں اتنی عمومیت اور وسعت نہیں ہوتی ہے۔ اس میں کسی مخصوص نقطۂ نظر سے الفاظ کو منتخب کر کے شامل کیا جاتا ہے اور اُسی زاویے سے اُن کی تشریح و توضیح کی جاتی ہے۔" (صفحہ 4)

فرہنگِ کُلّیاتِ سَودا کی مرتّبہ اسماء عزیز نے ایسا ایک بھی لفظ اپنی فرہنگ میں شامل نہیں کیا ہے جو لغوی معنی سے جدا مخصوص معنی یا مفہوم کے لیے سَودا نے استعمال کیا ہے۔ اس کے برعکس مرتّبہ نے زیادہ تر عام فہم الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور اُن کے وہی لغوی معنی لکھے ہیں جو بیشتر کتبِ لغات میں درج ہیں جیسے اُبال، ابد، ابر، با، باب، بابا، باپ، پات، پاک، پاکیزہ، تاب، تابش، تابندہ، تابوت، ثابت، ثنا، جا، جادو، جاوداں، چادر، خار، دادا، ذات، ذخائر، زاغ، ساخت، سادگی، سازش، شاخ، شادماں، شاعری، صابن، صاحب، طالب، ظالم، ظاہر، عابد، عاجز، غارت، غازہ، فارسی، فارغ، کاتب، کاسہ، کبوتر، مادر، ناپاک، وارث، یتیم ۔مندرج الفاظ کی طرح فرہنگ میں درج تمام الفاظ بھی اسی طرح کے ہیں جن کا استعمال سَودا نے لغوی معانی ہی میں کیا ہے۔

فرہنگ میں شامل بیشتر الفاظ کے معانی سیاق وسباق کے مدِ نظر تحریر نہیں کئے گئے ہیں بلکہ وہ تمام معنی تحریر کر دئے گئے ہیں جو استفادہ کی گئی فرہنگ میں درج ہیں جیسے شمر کے معانی یزید کے ایک سپاہ سالار یا فوج دار کا نام جس ملعون نے حضرتِ امام حُسین علیہ السلام کو میدانِ کربلا میں بُلا کر شہید کیا تھا۔ بس اسی وجہ سے یہ لفظ مردود و ملعون نابکار، بدذات، مقہور، ظالم کے معنی میں مستعمل ہو گیا۔ ملائی۔ تالاب۔ حوض۔

آدم کے معانی بھورا، مٹیالہ، گندمی، گندم گوں، گیہوں نما، پہلا آدمی ابوالبشر، سب آدمیوں کا باپ، مہادیو جی، پہلا آدمی جس سے انسان کی نسل چلی، وہ شخص جو اوّل ہی اوّل پیدا ہوا مبادا آدم درج کیے گئے ہیں۔

گیرائی کے معانی محکمۂ ٹھگی، وہ محکمہ جس میں ٹھگوں کے پکڑے جانے کا کام ہوتا ہے، پولس کا محکمہ، گرفتگی۔ پکڑ۔ خفیہ۔ پولس کا محکمہ تحریر کیے گئے ہیں۔

اس فرہنگ میں بعض ایسے الفاظ کی بھی شمولیت ہے جو کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں جیسے محمود کے معانی ایک بادشاہ کے بجائے تعریف کیا گیا تحریر ہے۔ سَودا نے ایک شعر میں لفظ 'لے پالک' بمعنی متبنّی، گود لیا ہوا، وہ بچّہ جسے لے کر پال لیا گیا ہو استعمال کیا ہے۔ مرتّبہ نے 'لے پالک' کے بجائے پالک کے معنی پلنگ، چارپائی، پالنے والا، سرپرست، پالا ہوا، پروردہ۔ ایک قسم کا ساگ درج کیے گئے ہیں۔

مذکورہ فرہنگ میں ہر لفظ کو حروفِ تہجّی کے اعتبار سے لکھنے کے بعد یہ بھی نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے اور مذکّر ہے یا مونث۔ اس کے بعد اس کے معانی و مفاہیم لکھے گئے ہیں اور اس کتاب کا مخفّف تحریر کیا گیا ہے جہاں سے اس کے معانی اخذ کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں کلّیاتِ سَودا سے اس شعر کو مع شعر نمبر اور صفحہ نمبر درج کیا گیا ہے جس میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس فرہنگ کا اندازِ ترتیب سائنٹفک اور ایک ضابطہ کے مطابق ہے۔

پی ایچ ڈی ڈگری کے حصول کے لیے قلم بند کی گئی زیبا ناز کی فرہنگ کا نام "فرہنگِ کلّیاتِ ذوق" ہے جس کا سنہ طباعت 2013 ہے۔ اس فرہنگ کو مرتّب کرنے کے لیے تنویر احمد علوی کی مرتّبہ کلّیاتِ شیخ محمد ابراہیم ذوق، ترقّی اُردو بیورو، نئی دہلی 2000 کو بنیاد بنایا گیا ہے اور اسی کلّیات سے اخذ کیے گئے ضروری الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، اصطلاحات اور فقروں کو مختلف کتبِ لغات و فرہنگ کی مدد سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذکورہ فرہنگ میں شامل مقدّمہ کے تحت ذوق کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ فرہنگ کی تعریف، لغت اور فرہنگ میں فرق، فرہنگ کی اقسام، فرہنگ کی ضرورت و اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اُردو فرہنگ نویسی پر عربی، فارسی اور انگریزی زبان کی فرہنگوں کے اثرات کا مختصر اُذکر بھی کیا گیا ہے۔

دیگر فرہنگوں کی طرح یہ فرہنگ بھی حروفِ تہجّی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔ سب سے پہلے معنی یا مفہوم طلب لفظ کو لکھ کر قوسین میں اس کے ہجّے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے۔ بعد ازاں معانی یا مفاہیم کے بعد قوسین میں اُس کتابِ لغت کا مخفّف تحریر کیا گیا ہے جہاں سے اس کے معنی اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد کلّیاتِ ذوق سے اُس شعر کو مع صفحہ نمبر نقل کیا گیا ہے جس میں معنی یا مفہوم طلب لفظ کی شمولیت ہے۔

بخیل، بخت، جادو، جود، درکار، دوست، دوستی، زکام، شہنشاہ، غش، قفس، قلیل، گرداب، لہجہ، محاسب، مداح، ناصح اور وادی جیسے الفاظ کو ذوق نے لغوی معنی ہی میں استعمال کیا ہے۔ اگر اس طرح کے عام الفاظ کو فرہنگ میں نہ شامل کیا جاتا تو اس فرہنگ کی اہمیت اور بڑھ جاتی۔ ذوق فہمی اور ذوق شناسی کے اعتبار سے یہ فرہنگ نہایت سودمند اور مفید ہے۔

ساجدہ قریشی کی دوسری فرہنگ کا نام "فرہنگِ باغ و بہار" ہے۔ یہ فرہنگ میر امّن کی شہرہ آفاق داستان 'باغ و بہار' کی لفظیات پر مبنی ہے۔

اس فرہنگ کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بابِ اوّل میں لغت اور فرہنگ میں فرق وامتیاز کو بھی واضح کیا گیا ہے اور اُردو میں فرہنگ نویسی کی روایت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بابِ دوم میں نثری ادب کی فرہنگوں کی اہمیت اور ضرورت اور طریقۂ کار اور اندازِ ترتیب کو واضح کیا گیا ہے۔ بابِ سوم میں 'باغ و بہار' کے لسانی رویّے، زبان بہ اعتبارِ کردار، محاورات، کہاوتیں اور ضرب الامثال، مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی، تابع مہمل، لفظی تکرار، قریب المفہوم اور ہم معنی الفاظ، متضاد الفاظ، مرکبات، خالص ہندی الفاظ، اشعار، کبت اور دوہرے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بابِ چہارم میں 'باغ و بہار' سے اخذ کئے گئے بعض ادبی اور معلوماتی الفاظ واشیاء کی درجہ بندی بھی کی گئی ہے۔ اس کے بعد حروفِ تہجی کے اعتبار سے کتاب کا اصل حصّہ فرہنگ ہے۔ اس فرہنگ میں ہکاری حروف بھ، پھ، دھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، کھ، گھ کو الف، ب، ج..... کی طرح حروف تصور کر کے اُن سے شروع ہونے والے الفاظ کو اُنھیں کے تحت درج کیا گیا ہے۔

تمام الفاظ کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد قوسین میں مخففات کے ذریعہ وضاحت کی گئی ہے کہ متعلقہ الفاظ کس زبان کے ہیں۔ اس کے بعد اُن الفاظ کے معانی یا مفاہیم تحریر کئے گئے ہیں۔ پھر قوسین میں بطورِ سند اس کتابِ لغت یا فرہنگ وغیرہ کے مخفف نام تحریر کئے گئے ہیں جہاں سے اُس کے معانی یا مفاہیم اخذ کیے گئے ہیں۔ سند یا شواہد کے لیے 'باغ و بہار' سے وہ جملے یا فقرے مع صفحہ نمبر درج کئے گئے ہیں جن میں وہ الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔

ساجدہ قریشی نے اس فرہنگ کو مرتّب کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ مرتّبہ نے 'باغ و بہار' میں شامل تمام معانی ومفاہیم طلب الفاظ کے اندراجات کے ساتھ اُن کہاوتوں، مصطلحات، رسومات اور اُن اشیاء کی بھی نشان دہی کی ہے جو عہدِ حاضر میں متروک ہوگئی ہیں یا جن کا چلن ختم ہوگیا ہے یا برائے نام رہ گیا ہے یا جن کے معانی مطالب بھی بدل گئے ہیں جیسے منگل کوٹی، تورہ پوش، اُردابیگنی وغیرہ۔

مشفق خواجہ کے مرتّبہ ''کلّیاتِ یگانہ'' 2003 کی لفظیات پر مبنی ملکہ بیگم کی فرہنگ کا نام ''فرہنگِ کلّیاتِ یگانہ'' ہے جو 2015 میں شائع ہوئی تھی۔ الفبائی ترتیب سے مرتّب کی گئی اس فرہنگ میں معانی طلب الفاظ لکھنے کے بعد مخففات کے ذریعہ وضاحت کی گئی ہے کہ تحریر کردہ الفاظ کا تعلّق کس زبان سے ہے۔ اس کے بعد معانی یا مطالب لکھ کر سند کے طور پر اُس لغت یا فرہنگ کا نام تحریر کیا گیا ہے جہاں سے معانی اخذ کئے گئے ہیں۔ پھر اُن اشعار کا اندراج ہے جن میں وہ الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔

اس فرہنگ کی ترتیب میں بطورِ خاص فرہنگِ آصفیہ، لغاتِ کشوری، فرہنگِ شفق، جامع فیروز اللغات، رہبرِ فارسی، فرہنگِ عامرہ اور مصباح اللغات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

دو ابواب میں منقسم اس فرہنگ کے بابِ اوّل میں ضمنی عنوانات کے تحت فرہنگ کے معنی ومفہوم اور ارتقاء پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی باب میں یگانہ کے سوانحی کوائف کے ساتھ ان کے فنّی وفکری امتیازات کو مع مثال آسان زبان میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے فن کی کسی اہم خصوصیت کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔

اس فرہنگ کا بابِ دوم ''فرہنگ'' کے لیے مختص ہے۔ فرہنگ کو بھی دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّہ میں معنی طلب الفاظ و تراکیب کا مع معانی اندراج ہے اور دوسرے حصّہ میں محاورات اور اُن کے مفاہیم تحریر کیے گئے ہیں جیسا کہ مرتبۂ فرہنگ کے ذریعہ تحریر کیے گئے عنوان ''محاورات'' سے ظاہر ہے۔ اس حصہ پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے واضح ہے کہ محاورات کے علاوہ کہاوتوں اور عام الفاظ کو بھی شامل کرنے سے گریز نہیں کیا گیا ہے جیسے آج مرے کل دوسرا دن، آگ بگولا، اندھیرے اجالے، اندھیرے گھر کا اجالا، چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی، خدا کی مار، دال میں نمک، گُڑ کھائیں گُلگلوں سے پرہیز، میدان کا چور وغیرہ۔

اس فرہنگ میں ایسے الفاظ کی بھی کثرت نظر آتی ہے جنھیں یگانہ نے لغوی معانی ہی میں استعمال کیا ہے اور وہ اُردو کی تمام کتبِ لغات میں مل جائیں گے جیسے الف ممدودہ ہی سے شروع ہونے والے مندرج چند الفاظ: آبلہ، آتش، آشکار، آشیانہ، آغاز، آغوش، آفت، آئینہ، آہنگ۔

ساجدہ قریشی کی ایک موضوعاتی فرہنگ کا نام ''تلمیحاتِ انشاء مع شخصیات'' ہے جو کلامِ انشاء میں مستعمل تمام تلمیحات و اشارات اور شخصیات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس فرہنگ کا سنہ اشاعت 2017 ہے۔ ادب کی دیگر اصناف کی بہ نسبت شعراء و ادباء کی نگارشات میں مستعمل تلمیحات کی کتب کی تعداد بہت کم ہے۔ ساجدہ قریشی کی یہ تلمیحی فرہنگ اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ وہ تمام تلمیحات مع شخصیات یکجا ہوگئی ہیں جنھیں انشاء جیسے قادرالکلام شاعر نے موقع ومحل کی مناسبت سے اپنے کلام میں نظم کی ہیں۔ انشاء کے یہاں مذہبی قصص وعقائد، تاریخی وفرضی واقعات، رسوم ورواج، ضرب الامثال، دیومالا اور صنمیات سے متعلّق تلمیحات کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ مذکورہ فرہنگ میں تمام تلمیحات وشخصیات کا بہ اعتبارِ حروفِ تہجی اندراج کیا گیا ہے۔ ہر تلمیح کی تشریح و وضاحت اور ہر تلمیحی شخصیت کے تعارف کے بعد اس شعر کو بھی بطورِ سند تحریر کیا گیا جس میں

متعلّقہ تلمیح یا شخصی تلمیح کو انشاء نے استعمال کیا ہے مثلاً بیمارِ کربلا:

حضرتِ امام زین العابدین کو بیمارِ کربلا کہا جاتا ہے۔ آپ حضرتِ امام حُسین کے فرزند اور بارہ اماموں میں سے چوتھے امام ہیں۔ آپ کا نام علی اور کنیتیں ابومحمّد، ابوالقاسم اور ابوالحسن ہیں۔ زین العابدین، زین العبا، سیّد الساجدین، ذکی اور امین القاب ہیں۔ آپ کو سجّاد اور عابد بھی کہا جاتا ہے۔ 15/ جمادی الثانی 38ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ کا نام شہر بانو تھا۔ آپ سفرِ کربلا میں حضرتِ امام حُسین کے ساتھ تھے لیکن علالت کی وجہ سے جنگ میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کو بیمارِ کربلا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب آپ کو اہلِ بیت کے ساتھ اسیری کی حالت میں شام لے جایا گیا تو وہاں آپ نے یزید کے سامنے بے خوفی کے ساتھ آوازِ حق بُلند کی۔ اس کے بعد آپ اہلِ بیت کے ساتھ مدینہ لوٹے۔ 25/ محرم 95ھ کو آپ نے وفات پائی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کو ولید بن عبدالملک کی سازش سے زہر دیا گیا تھا۔

شفا تصدّقِ بیمارِ کربلا ہو مجھے
سحابِ لطف کو کر حکم، تا کرے ترشیح

(44)

اس فرہنگ میں کلامِ انشائسے اخذ کی گئیں آتشِ طور، تیشہ و بے ستوں، چاہِ نخشب، راجہ اِندر کا اکھاڑا، سحرِ سامری، سوزنِ عیسیٰ، عصائے موسیٰ، قُم باذن اللہ، کنہیا، گاؤ زمیں، ماہِ کنعاں، نل و دَمن، ہیر رانجھا، یدِ بیضا جیسی تقریباً 215 تلمیحات و شخصیات کی شمولیت مع تفصیل و تشریح ہے جن کی مثال بہ وجہ طوالت مناسب نہیں۔ یہ تلمیحی فرہنگ انشاء شناسی کے اعتبار سے بھی اہم ہے اور دیگر شعراء و ادباء کی نگارشات میں مستعمل تلمیحات کو سمجھنے میں بھی ممد و معاون ہوگی۔

ساجدہ قریشی کی مرتّب کردہ چوتھی فرہنگ کا نام ''فرہنگِ توبتہ النصوح'' ہے جو 2018 میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ یہ فرہنگ مولوی نذیر احمد کے شہرہ آفاق ناول ''توبتہ النصوح'' کی لفظیات پر مبنی ہے۔ تین ابواب پر مشتمل اس فرہنگ کے بابِ اوّل کے پہلے حصّہ میں لغت اور فرہنگ میں فرق و امتیاز کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی باب کے دوسرے حصے میں اُردو میں فرہنگ نویسی کی روایت کا تفصیل سے جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ دوسرے باب کے پہلے حصے میں نثری ادب کی فرہنگوں کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی باب کے دوسرے حصے میں ''طریقۂ کار اور اندازِ ترتیب'' کے ضمنی عنوان کے تحت فرہنگ مرتب کرنے کے طریقۂ کار سے واقف کرایا گیا ہے۔ بابِ سوم میں فرہنگ سے پہلے ''توبتہ النصوح'' میں مستعمل اہم ادبی اور معلوماتی الفاظ و اشیاء مثلاً آتش بازی، مضامیر، جانور، پوشاکیں، پیشے و پیشہ وران، پھل، تلمیحات، جواہرات، رشتے، شخصیات، غذائیں، مقامات وغیرہ کی اس لیے درجہ بندی کی گئی ہے کہ قارئین کو ایک ہی نظر میں مولوی نذیر احمد کی وسیع معلومات کا اندازہ بھی ہو سکے گا اور اس قسم کے الفاظ ادبی، لسانی، سماجی اور معاشرتی موضوعات کے مطالعے کے تعلّق سے بھی معاون ثابت ہوں گے۔

توبتہ النصوح سے اخذ کیے گئے معانی یا مفاہیم طلب تمام الفاظ کو بہ اعتبارِ حروفِ تہجّی درج کرنے کے بعد مخفّفات کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے کہ تحریر شدہ لفظ کس زبان کا ہے۔ بعد ازاں معانی یا مفاہیم کا اندراج ہے اور قوسین میں بطورِ سند اس کتابِ لغت یا فرہنگ کا مخفّف نام بھی تحریر کیا گیا ہے جہاں سے اس کے معانی و مفاہیم اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ''توبتہ النصوح'' کے متن سے اُن جملوں یا فقروں کو مع صفحات نمبر اور سطر نمبر درج کیا گیا ہے جن میں متعلّقہ الفاظ کی شمولیت ہے مثلاً

زبردست کا ٹھینگا سر پر (1) غالب سے زور نہیں چلتا، اس کی ماننا پڑتی ہے۔ (م ل)

ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر، اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔ (181-10)

فرہنگِ توبتہ النصوح نہ صرف توبتہ النصوح فہمی کے اعتبار سے ایک کارآمد اور سودمند فرہنگ ثابت ہوگی بلکہ نذیر احمد کے دیگر ناولوں کا مطالعہ کرنے میں بھی کسی حد تک معاون ہوگی۔

ساجدہ قریشی کے علاوہ بیشتر خواتین نے پہلی بار اور پی ایچ ڈی ڈگری کے حصول کے لیے فرہنگیں مرتّب کی ہیں۔ وقت کی پابندی اور کچھ اصولِ فرہنگ نویسی سے ناواقفیت کے سبب بعض فرہنگوں میں معمولی اور بعض میں واضح خامیاں در آئی ہیں پھر بھی اس تحقیقی و تنقیدی جائزہ کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ فرہنگ نویسی کے میدان میں خواتین نے قابلِ ستائش اور حوصلہ بخش خدمات انجام دی ہیں۔

□□□

Shazya Zarrin
Jain Mandir Street
Phoota Mahal
Rampur-244901 (U.P)

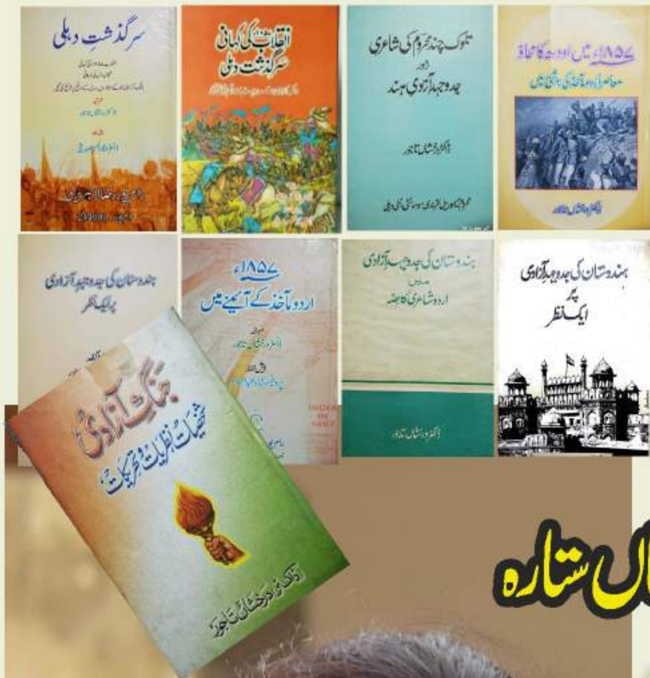

بشریٰ صدیقی

گورکھپور میں اردو ادب کا درخشاں ستارہ

ڈاکٹر درخشاں تاجور

ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی بے شمار جان و مال کی قربانیوں کے بعد نصیب ہوئی۔ 15 اگست 1947 کو ہندوستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر آزاد ہوا۔ ہمیں آزادی کی سوغات نصیب تو ہوئی پر بٹوارے کی دردناک اذیت کے ساتھ، لاکھوں لوگوں نے نقل مکانی اور ہجرت کی تکالیف جھیلیں۔ کل تک جو ساتھ مل کر آزادی کے لیے لڑے تھے آج وہ خود آپس دست و گریباں تھے۔ تقسیم کے دردناک سانحہ نے آزادی کی خوشی کو پسپا کر دیا تھا۔ انگریز ہندوستان سے جاتے جاتے ہندوستانیوں میں نہ صرف پھوٹ ڈال گئے بلکہ نفرتوں کا بیج بھی بونے میں کامیاب رہے۔ چونکہ تقسیم مذہب کو بنیاد بنا کر ہوئی تھی اس لیے زیادہ تر مسلمان اسلامی ملک کی چاہ میں پاکستان جا بسے اور ہندوستان میں بچے مسلمان اپنے ہی ملک میں تشدد کا شکار ہو گئے۔ مسلمانوں کے بعد تقسیم کا سب سے زیادہ نقصان زبان اردو کا ہوا۔ اردو کی جائے پیدائش ہندوستان ہے لیکن تقسیم کے بعد ہندوستان کی دوسری قوموں کے لوگوں نے اسے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس سے دوری اختیار کر لی۔ مسلمان اور اردو دونوں اپنے ہی ملک میں نشانۂ ملامت بن گئے۔ خیر تقسیم کی آگ جب ٹھنڈی ہوئی تو قوانین ہند نے مسلمان اور اردو دونوں کو تحفظ بخشا۔

انگریز ہندوستان تو تجارت کے بہانے آئے تھے لیکن وہ آہستہ آہستہ تجارت سے سیاست کی طرف اپنے قدم جمانے لگے ہندوستانیوں پر ان کے ظلم و ستم جب حد سے تجاوز کرنے لگے تو عوام نے 1857 میں انگریزوں کے خلاف آزادی کا بگل پھونک دیا۔ پہلی جنگ آزادی کو انگریزوں نے بغاوت کا نام دیا۔ انگریز تلملا گئے اور ان کا ظلم و ستم اور شدید ہو گیا۔ چونکہ 1857 کی لڑائی منظم اور مربوط طور پر شروع نہیں

ہوئی تھی بلکہ وہ منتشر تھی اس لیے یہ کامیاب نہیں ہو پائی لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ پورے ملک میں آزادی کی جدوجہد شروع ہو گئی اور گورکھپور کا علاقہ بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا۔ مولوی سرفراز علی گورکھپور کے ایک عظیم مجاہد آزادی تھے جنھوں نے انگریزوں کے ظلم وستم کے آگے سر نہ جھکایا۔ وہ خود بھی لڑے اور دوسروں کو بھی انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے ترغیب دی۔ شکست کے بعد انھوں نے جلا وطنی کا عذاب جھیلا، اور غریب الوطنی کی حالت میں کاٹھمنڈو میں کسمپرسی کی حالت میں ان کی وفات ہوئی۔ تاریخ کے صفحات میں اس مجاہد کو وہ جگہ نہ ملی جس کا یہ حقدار تھا آزادی کی جو آگ مولوی سرفراز علی کے دل میں لگی تھی وہ ان کی نسلوں میں منتقل ہو گئی اس عظیم مجاہد کے خاندان کی ایک شمع سرزمین گورکھپور میں آج بھی روشن ہے جس کو دنیائے ادب ڈاکٹر درخشاں تاجور کے نام سے جانتی ہے۔

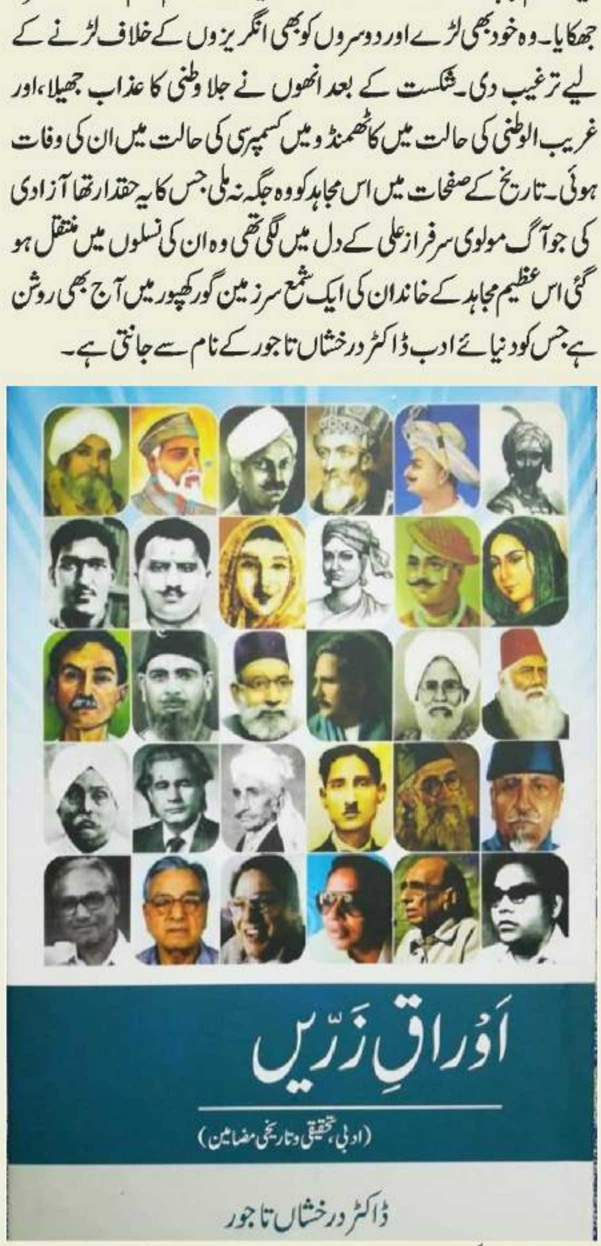

ڈاکٹر درخشاں تاجور صرف مجاہدین آزادی کے خاندان سے ہی تعلق نہیں رکھتیں بلکہ ان کے جد امجد حضرت حکیم سید رافت اللہ اور حضرت سید صبغت اللہ قدس سرہٗ العزیز کا شمار مشائخ گورکھپور میں کیا جاتا ہے۔ ان کے دادا واسع گورکھپوری نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر تھے بلکہ انور حسین آرزو لکھنوی کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے۔ ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان کی وراثت کو سنبھالنے والی درخشاں تاجور جب میدان ادب میں آئیں تو تحریک آزادی کی تاریخ کے لیے اپنے قلم کو وقف کر دیا۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور نہ صرف تحریک آزادی کے متعلق لکھ رہی ہیں بلکہ ان تمام راز ہائے پنہاں پر روشنی ڈال رہی ہیں جنھیں تاریخ دانوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

ڈاکٹر درخشاں تاجور کی پیدائش گورکھپور کے سوداگر محلے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سعید از ظفر اور والدہ کا نام فہمیدہ خاتون تھا۔ شروعاتی تعلیم گھر اور مکتب میں ہوئی۔ امام باڑہ مسلم گرلس کالج سے گریجویشن پورا کرنے کے بعد گورکھپور یونیورسٹی سے ایم اے کی تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر اختر بستوی کی نگرانی میں ''ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ'' کے زیر عنوان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تحریک آزادی کو ہی کیوں منتخب کیا؟ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر درخشاں تاجور کہتی ہیں ''چونکہ اردو میں آزادی کے حوالے سے کوئی ٹھوس کتاب نہیں تھی تو میرے دل میں جذبہ پیدا ہوا کہ میں اس موضوع پر قلم اٹھاؤنگی''۔ اپنے تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر درخشاں تاجور نے نوے سالہ طویل تحریک آزادی پر اردو شاعری کے اثرات کو واضح کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تاریخ کے آئینے میں اس وقت کے ہندوستان کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس تحقیقی مقالے پر 1991 میں اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام بھی دیا۔

تحقیقی مقالے کے بعد تو جیسے درخشاں تاجور اور تحریک آزادی کا موضوع ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن گئے۔ ایک کے بعد ایک تحریک آزادی کے موضوع پر 9 کتابیں تالیف وتصنیف کی۔ ان میں سے تقریباً سبھی کتابوں پر انھیں انعام سے نوازا گیا۔ رفیع احمد قدوائی انعام 1985 برائے مضمون ''جنگ آزادی میں اردو کا حصہ''، اتر پردیش اردو اکادمی انعام 1991 برائے تصنیف ''ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ'' اتر پردیش اردو اکادمی انعام 2004 میں ''جنگ آزادی شخصیات، نظریات وتحریکات، اتر پردیش ہندی سنستھان 2005 سرگزشت دہلی (ہندی)، سرگزشت دہلی (اردو) پر 2007 میں بہار اردو اکادمی نے حسن عسکری ایوارڈ سے نوازا، 1857 اردو ماخذ کے آئینے میں'' 2011 میں اتر پردیش اردو اکادمی انعام، ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نظر 2013 میں بہار اردو اکادمی نے حسن عسکری ایوارڈ 2015 میں دیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان ٹائمز لکھنؤ، اسٹار چیریٹیبل ٹرسٹ گورکھپور، انجمن ترقی اردو ہند گورکھپور نے مجموعی ادبی خدمات پر محترمہ کو انعامات سے نوازا ہے 1857 میں اودھ کا محاذ۔ معاصر اردو ماخذ کی روشنی پر بہار اردو اکادمی واتر پردیش اردو اکادمی دونوں اداروں نے انعام سے نوازا۔

ڈاکٹر درخشاں تاجور کا تحقیقی مقالہ جب شائع ہوا تو معروف شاعر مجروح سلطانپوری صاحب نے ان کے نگراں ڈاکٹر اختر بستوی کو خط لکھ کر مقالے کی پذیرائی کی۔اب تک ڈاکٹر درخشاں تاجور کی ۹ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اس وقت وہ اپنے تحقیقی مقالے کے ہندی ترجمے پر کام کررہی ہیں۔تعلیم کے دوران آل انڈیا ریڈیو گورکھپور میں ایک انشائیہ ''تنگ آچکے ہیں میگزین ادھار مانگنے والوں سے'' کے عنوان سے ریڈیو پر نشر ہوا تھا جسے سن کر ڈاکٹر سلام سندیلوی نے درخشاں تاجور کے نام ایک خط لکھا۔خط کا مضمون کچھ یوں تھا:-

> ''کل شام کا تمہارا مضمون مفت میگزین پڑھنے والوں کے بارے میں ریڈیو اسٹیشن گورکھپور سے سنا۔مضمون نہایت دلچسپ اور دلآویز انداز میں تم نے لکھا ہے۔اس میں انشائیہ کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔اس کے علاوہ تم نے جس انداز سے مضمون پڑھا ہے وہ بہت دلکش اور مسرت افزا ہے اس میں ڈرامائی انداز موجود تھا۔تم میں بہت سی صلاحیتیں موجود ہیں اگر تم ان صلاحیتوں سے کام لوگی تو ادب میں بہت ترقی کروگی اور بہت شہرت حاصل ہوگی''۔

(اوراق زرین ص9)

ڈاکٹر درخشاں تاجور کہتی ہیں کہ ''اس خط نے میرے قلم سے رشتے کو ایک نئی طاقت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج میں بے شمار کتابیں لکھ چکی ہوں''۔ڈاکٹر درخشاں تاجور نے آل انڈیا ریڈیو گورکھپور کے لیے بے شمار مضامین اور فیچر بھی لکھے۔مئی 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے 150 سال پورے ہونے کے موقع پر رامپور رضا لائبریری نے ان کی کتاب ''سرگزشت دہلی'' (اردو) شائع کی۔جو 2005 میں رام پور رضا لائبریری ہندی میں شائع کرچکی تھی۔اس کتاب کو پاکستان کے بھی کسی پبلشر نے شائع کیا ہے جسے کافی مقبولیت حاصل ہوچکی ہے۔سرگزشت دہلی دراصل ایک روزنامچہ ہے جسے جیون لال نے تحریر کیا تھا۔اس روزنامچے سے دربار مغلیہ کی ایک ایک خبر جو اس نے انگریزوں کو دی تھی سامنے آتی ہے۔اس روزنامچے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کسی طرح بہادر شاہ ظفر آخری وقت تک اپنی رعایا کو قتل وغارت سے بچانے کے لیے کوشاں رہے۔ڈاکٹر درخشاں تاجور کی ایک اور کتاب ''اوراق زریں'' کے متعلق مہندر پرتاپ چاند کہتے ہیں:

> ''یہ آزادی کی دونوں تحریکوں سے متعلقہ کچھ نمایاں شخصیات کا تفصیلیت احاطہ کرتی ہیں جن میں سیاسی اور قومی رہنما بھی ہیں،اپنی جانیں قربان کردینے والے سورما بھی ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعہ خون گرمانے والے شاعر،ادیب اور صحافی بھی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مضامین کو اسکولوں،کالجوں اور یونیورسٹی کی نصابی کتابوں میں شامل کیا جائے........'' (ص آخر اوراق زریں)

''اوراق زریں'' کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب ''1857 میں اودھ کا محاذ معاصر اردو ماخذ کی روشنی میں'' بھی قابل ذکر ہے۔اس میں انھوں نے دس کتابوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔اس کتاب میں درخشاں تاجور نے اودھ کے خصوصی حوالے سے تحریک آزادی کو تحریر کیا ہے۔اس کتاب میں نہ صرف خطۂ اودھ کی تاریخ کا پتا چلتا ہے بلکہ سیاسی اور سماجی ماحول کا بھی پتا چلتا ہے۔اردو ادب میں بیگماتی زبان کے قصے تو بہت بیان ہوئے پر ڈاکٹر درخشاں تاجور نے پہلی بار تاریخ کے آئینہ میں بیگمات کے خطوط کی اہمیت کو واضح کیا۔اس کے علاوہ اس کتاب میں اودھ میں کس طرح انقلاب برپا ہوا کس طرح انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی شروع ہوئی،اس کو تاریخ کے حوالے سے جانچا اور پرکھا گیا ہے۔

تحریک آزادی کے متعلق ڈاکٹر درخشاں تاجور کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ان کی کتابیں خود اس بات کی شاہد ہیں۔ایک ہی موضوع پر مسلسل نو کتابیں تحریر کرنا اپنے آپ میں کمال ہے۔ایک خاتون خانہ ہوتے ہوئے بھی،خانگی زندگی کے تمام فرائض اور لوازمات کو نبھاتے ہوئے تحریک آزادی کے مشکل موضوع پر تحقیق کے ساتھ کام کرنے کے لیے دشوار گزار مراحل سے گزرنے کے لیے کس قدر محنت کی ہوگی اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔اردو ادب کے دامن میں ایک بڑی کمی یہ تھی کہ جس ہندوستان میں پیدا ہوئیں اسی ملک کی تحریک آزادی پر کوئی مکمل کتاب نہیں تھی اور جو کچھ موجود تھا وہ آدھا ادھورا سا اور ادب کی زلف پیچاں میں کہیں گم ہوگیا تھا۔ڈاکٹر درخشاں تاجور نے تحریک آزادی پر ایک کے بعد ایک نو کتابیں لکھ کر اردو کو اس قابل بنادیا کہ اس موضوع پر مکمل اور مستند حوالوں کے لیے کسی دوسری زبان کی طرف نہیں دیکھنا پڑے گا۔اردو ادب ہی نہیں بلکہ تاریخ بھی ڈاکٹر درخشاں تاجور کی ان کاوشوں کے لیے ان کی مرہونِ منت رہے گی۔□□□

Ms. Bushra Siddiqui
Research Scholar
Dept. of Urdu
Lucknow University
Lucknow226007 (U.P)

شاعرات کے منتخب اشعار

نالہ و شیون و فغاں کے سوا
دل عاشق سے کیا نکلتا ہے

اے جمیلہ بنو برہمن تم
بت کے دل سے خدا نکلتا ہے

راضیہ خاتون جمیلہ

ابھرتی گئیں طعن و تشنہ سے قومیں
نشاں بن گیا بے نشاں کہتے کہتے

اسی طرح آیا ہے راہِ عمل پر
جہاں کا ہر اک کارواں کہتے کہتے

نثار فاطمہ کبریٰ

دشمنوں کا تو چلا زور بھی اور جادو بھی
آرے چلتے ہیں جگر پر کہ مری کچھ نہ چلی

شیخ کترائے کہ جھنجھٹ نہ ہو ناحق سرِ رہ
سانس لی میں نے بھی کھل کر کہ بلا سر سے ٹلی

زاہدہ خاتون شروانیہ

دیدنی ہے ترے عتاب کا رنگ
شیشۂ چشم میں شراب کا رنگ

گزری تمام عمر خزاؤں کے درمیاں
اب التفات فصل بہاراں کا کیا کروں

رابعہ پنہاں

فلک کی طرفہ کاری ہے کہ آج اے زیب دنیا میں
جو تھے صیاد وہ خود طائر بے بال و پر نکلے

کیا چیز تھی بھلا وہ ہر دور معصیت میں
جس نے جہاں میں قوموں کی آبرو بچا لی

زیب عثمانیہ

جو لذت میسر ہے ذوقِ طلب میں
نہیں اس سے واقف ترے عرش والے

گردشِ چرخ کہہ رہی ہے بشیر
جذب کامل سے کیا نہیں ہوتا

بشیر النساء بیگم بشیر

کوئے جاناں کا مل گیا رستہ
ہو گیا راہبر ہمارا عشق

شاد و آباد غم کی دنیا ہے
بے سہاروں کا ہے سہارا عشق

صالحہ بیگم مخفی

شوق کہتا ہے کہ چلیے کوئے جاناں کی طرف
چاہیے وارفتگی کی پاس داری ان دنوں

چھوڑ دو اس بے وفا دنیا کو تم بھی اے حیا
کرنہیں سکتا ہے کوئی غم گساری ان دنوں

حیا لکھنوی

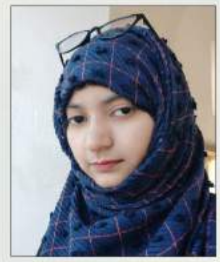

صائمہ انصاری

امیدوں کا موسم

موسم گرما کی آہٹ تیز تھی، کھیتوں میں کام کرتا کسان حسرت بھری نگاہوں سے بار بار سورج کی طرف دیکھتا اور اس کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ کسان رامو ایک نظر سورج تو ایک نظر آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔ پسینے سے لت پت اس کا جسم سورج کی تپش سے چمک رہا تھا۔ دوپہر کا وقت ہو آیا۔ رامو کی دھرم پتنی اور بیٹا چنو، کھانا لیے کھیت آ پہنچے۔ چنو نے دور سے ہی اپنے بابا کو آواز دیتے ہوئے دوڑ لگا دی۔۔۔۔۔ پاس پہنچتے ہی وہ رامو سے لپٹ گیا۔ رامو کی بیوی جانکی نے زمین پر ایک چادر بچھا کر کھانا لگایا اور دونوں زوجہ وشوہر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کھانے سے فارغ ہو کر رامو کچھ دیر وہیں درخت کے زیر سایہ آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ تھکن سے چور رامو کے جسم کو نیند نے کب اپنی آغوش میں لے لیا اسے خبر تک نہ ہوئی۔ غریبوں کی نیند بھی موسم کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی کہیں ٹک کر نہیں رہتی۔ چنتاؤں میں گھری زندگی قرض اور سود میں ڈوبی حیات کی ڈور کب ٹوٹ جاتی ہے پتہ تک نہیں چلتا اور کسان کو ایک سکون کی نیند تک نصیب نہیں ہوتی۔ سو رامو کی آنکھ بھی جھٹ سے کھل گئی جیسے وہ چونک پڑا اور وہ اٹھ کر دوبارہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

گرمی کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ کسان طبقہ گرمی سے بے حال جلد از جلد اپنے کھیتوں کا کام پورا کر لینا چاہتا تھا۔ رامو کا پڑوسی برجو کام میں مگن رامو سے مخاطب ہوتا ہے۔ "رامو کاکا۔۔۔۔ بس اب بارش کا انتظار ہے کھیتوں میں پانی بھی پورا ہو جائے گا اور ہمیں اس بدن جھلساتی گرمی سے نجات بھی مل جائے گی۔" رامو نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا" بھگوان کی مرجی بھئی تو بارش آوت دیر نہ لاگی بھیا۔"

دن، ہفتہ اور مہینہ گزر گیا۔ بارش کی آمد تو ہوئی لیکن ذرا دیر سے۔۔۔۔۔ چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ڈوڑ گئیں، ہر سمت ہریالی ہی ہریالی پھیل گئی۔ کسانوں نے راحت کی سانس لی سب خوش تھے۔

لیکن دیر سے آئی یہ بارش برسی، تو برستی چلی گئی۔ ہر سمت پانی ہی پانی تھا اور دیکھتے دیکھتے اس رحمت نے زحمت کا روپ دھارنا شروع کیا۔

"اب تو یہ پانی آفت بنتا جا رہا ہے رامو کاکا"۔ برجو لبالب پانی سے بھرے کھیت میں اپنے قدموں سے راستہ بناتے ہوئے رامو سے مخاطب ہوا۔

رامو: "ہاں برجو اب تو اس آفت کی بارش کو روکنے کی پرارتھنا کرنی ہوگی گرمی پڑے تو شدّت اختیار کرتی ہے، برسات میں بارش جیسی نعمت ہمارے لیے وبال جاں بن جاتی ہے۔"

سر سے پاؤں تک بھیگا رامو گھر پہنچا اپنے بیٹے چنو کو مٹی کے کھلونوں سے کھیلتا دیکھ کر اس کی طبیعت میں شادمانی آ گئی۔۔۔۔۔ وہ ماں باپ ہی تو ہوتے ہیں جو بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر پل بھر میں اپنی ساری تکان اور رنج وغم بھول جاتے ہیں۔ جانکی نے رامو کو لا کر سوکھے کپڑے دیے اتنے میں چنو دوڑ کر اپنے بابا کی گردن پر آ کر لٹک گیا اور فرمائشیں شروع کر دیں، بابا مجھے ایک میمنہ (بکری کا بچہ) لا دینا۔ ان کھلونوں سے

کھیل کر میں تھک گیا ہوں، اب مجھے میمنے کے ساتھ کھیلنا ہے اور ساتھ میں ایک ہیلی کا پٹر بھی، پھر ہم دونوں میں اور میرا پچکو (میمنہ) اس ہیلی کا پٹر میں بیٹھ کر اڑیں گے۔۔۔ رامو نے چنو کی معصوم سی ضد پوری کرنے کا وعدہ کر لیا اور حسبِ وعدہ اگلے ہی دن ایک ننھا سفید رنگ کا خوبصورت سا میمنہ لا کر اپنے چھ سالہ بچے چنو کے حوالے کر دیا۔ چنو کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اب وہ دن رات اسی کے ساتھ کھیلتا، سوتا اور جاگتا چنو اب میمنے میں ہی مگن تھا۔۔۔۔۔

وقت گزرتا گیا، دن بیتتے گئے، بارش کی رفتار نہ تھمی ندیوں اور تالابوں کو جل تھل کرتا پانی گاؤں میں گھس آیا اور دیکھتے دیکھتے گاؤں کے گاؤں ڈوبنے لگے۔ رامو جانکی سے کہتا ہے کہ مجھے خدشہ ہے اگر بارش کی یہی رفتار رہی تو عنقریب بڑا سیلاب آتے دیر نہ لگے گی۔ آج ہی سارا ضروری سامان چھت پر رکھ لو نہیں تو سارا اثاثہ ڈوب جائے گا۔۔۔۔ جانکی نے سارا سامان اوپر چھت پر پہنچانا شروع کیا، کم و بیش یہی حال ہر گھر کا تھا۔ سارا گاؤں اپنا اپنا اثاثہ زندگی سر شام چھت یا اوپری منزل پر پہچانے میں لگا رہا۔ رات ہونے کو آئی سارا گاؤں اپنی اپنی چھتوں پر تھا۔ سب کے چہرے ایک انجانے خوف سے فق پڑ چکے تھے، آگے کیا ہوگا سوچ کر سانسیں پھول رہی تھیں۔۔۔ جیسے تیسے لوگوں کی آنکھ لگی اور نیند کی آغوش میں تھے کہ صبح کی پہلی کرن نے دستک دے دی۔ علی الصبح آنکھ کھلی تو سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گاؤں کا قریبی باندھ جو کہ ندیوں کے پانی کو خود میں اکھٹا رکھتا ہے کھولا جا چکا تھا۔ جس نے سارے گاؤں کو ایک خوفناک سیلاب کی زد میں لا کھڑا کیا تھا۔۔۔ جانے کتنے لوگ اس سیلاب کی زد میں آ کر مع ساز و سامان تو کیا اپنا وجود بھی نہ بچا سکے، کتنوں کی جھونپڑیاں اپنا نشان کھو بیٹھیں اور کتنوں کے گھر پوری طرح جل تھل ہو گئے۔۔۔ رامو کا گھر ذرا اونچائی پر تھا لیکن پھر بھی پانی کی زوردار لہریں اس کی چھت کو چھو کر گزر رہی تھیں۔۔۔

دن گزرتے رہے پانی بڑھتا گیا۔ ہزاروں گاؤں اسی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ ادھر ضلع کے فلوڈ سیکشن آفس میں کام کر رہا رام دین، اپنے افسر سے مخاطب ہوا، "صاحب گاؤں کے گاؤں ڈوبتے جا رہے ہیں"۔ آفیسر (جھلاہٹ میں): اُدھر دیس کی اکانومی بھی ڈوب رہی ہے، اُسے دیکھیں یا گاؤں دیکھیں"۔ رام دین سر جھکائے کھڑا رہا۔ شاید اسے اپنے افسر کی بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔

ادھر ایک خوفناک رات کی آمد ہوئی، رامو اور جانکی اپنی فکروں میں گم ایک اچھی صبح کی امید میں سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ جانکی بول اٹھی۔" جانے کیوں آج میرا جی اتنا گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے سو نہ پاؤں گی۔" رامو تسلی بخش لہجے میں بولا" آج کل جی کس کا نہ گھبراتا چاروں طرف کا یہ خوفناک ماحول دیکھ کر اچھے بھلے آدمی کو بھی موت سامنے نظر آتی۔ تو چنتا نہ کر بھگوان کا نام لے اور سو جا۔" جانکی نے اپنا ایک ہاتھ چنو کے سینے پر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔۔۔۔۔۔

رات اپنے آخری پہر پر تھی لہروں کی خوفناک آوازیں چاروں اور گردش کر رہی تھیں، فضا میں نہ جانے کیسی گونج تھی یہ وہ وقت تھا جب آفت زدہ تھکے ہارے کسان اور ان کے بال بچے گہری نیند میں سو رہے تھے۔ تبھی پچکو (میمنہ) کی ڈور جانے کیسے ڈھیلی ہو گئی اور وہ کھل کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ تبھی اس کا پاؤں چنو کے پاؤں پر پڑا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پچکو کو کھلا دیکھا تو خود بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جھپٹ کے اس کی ڈوری تھام اسے چھت کی منڈیر پر لگے لوہے سے باندھنے لگا۔ پچکو کی اچھل کود جاری تھی یک بیک اس کا پچھلا پیر چھت سے الگ پڑ گیا وہ خود کو سنبھال نہ سکا اور نیچے سرکنے لگا۔ چنو ہکا بکا جان سے پیارے پچکو کو پانی میں گرتا دیکھ کر اسے اوپر کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ چنو کو چلانے کا بھی ہوش نہ رہا اور وہ اپنے دوست پچکو کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگا وہ اس کی ڈوری چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ چونکہ چنو نہایت چھوٹا تھا اس کی جدوجہد کام نہ آء اور وہ خود بھی پچکو کے ساتھ ساتھ گھسٹتا چلا گیا اور آخرکار دونوں ساتھ ساتھ پانی کی لہروں میں جا گرے۔ پانی کی لہروں کی خوفناک آوازوں نے دو ننھے وجود کی آوازوں کو خموش کر دیا۔

صبح اپنے معمول پر آئی۔ علی الصبح جانکی کی آنکھ کھلی چنو کو کہیں نہ پا کر وہ چیخ اٹھی۔ رامو بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ تاحد نظر پانی ہی پانی تھا اور اس کی موجیں مارتی ہوئی لہریں خوفناک ماحول پیدا کر رہی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ چنو پانی میں جا گرا ہے۔ گاؤں میں دور کہیں آواز بلند ہوئی۔ کوئی چیخ رہا تھا۔ ارے وہاں ایک کھونٹی دار درخت میں رامو کا لڑکا اور اس کا میمنہ پھنسے ہوئے ہیں۔ دیر تک پانی میں ڈوبے رہنے سے دونوں کے جسم پھول گئے تھے۔ جانکی غش کھا کر گر پڑی، رامو اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ اب اِس بگڑی کو کون بنانے والا تھا۔

ہفتہ گزرنے کو آیا۔ کئی جگہ راحت کا کام چل رہا تھا۔ لگاتار نیوز رپورٹرز اور اخباری نمائندے جانی مالی نقصان کا اندازہ کر رہے تھے۔ سیلاب زدگان کو راحت کے طور پر ان کا دکھ درد بانٹنے کے لیے کھانے پینے کی چھوٹی موٹی چیزیں تقسیم کی جا رہی تھیں۔ ادھر جانکی بھوک پیاس سے بے سدھ پڑی تھی۔ چاروں اور گھور سناٹا اور مایوسی پسری ہوئی تھی۔ اس

خوفناک سیلاب کی لہریں آج بھی کانوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ جانکی بغیر پلکیں جھپکائے آبدیدہ ان لہروں کو گھور رہی تھی گویا وہ ان سے باتیں کررہی ہو۔ جانکی خود کلامی میں: "اے اچھلتے پانی مجھے تجھ سے خوف نہیں آرہا میرے جگر کا ٹکڑا تیری گود میں سویا ہوا ہے۔ ذرا اس کا خیال رکھنا اس نے آج بھی اپنے پچلو کی رسی اپنی ننھی مٹھی میں پکڑی ہوئی ہے۔ اے موجیں مارتی لہر واس کا خیال رکھنا۔۔۔۔۔۔

کچھ ہفتوں بعد تباہی مچا کر سیلاب کا پانی اترنے لگا تھا۔ برجو رامو کو دلاسہ دے رہا تھا" غم نہ کرو راموکا کا یہ وہ سنکٹ ہے، جو ہر سال ہمیں جھیلنا ہوتا ہے بھلا کسے ہماری فکر جو اس کی کچھ تدبیر کرے"۔ رامو کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپک پڑا۔۔۔۔ پانی کے سوکھنے پر کیچڑ سے لبریز گاؤں کی زمین اور اسی میں کسانوں کی آمد ورفت عجیب عجیب نشان لیے خوفناک معلوم پڑ رہی تھی۔ گویا وہ کوئی کیچڑ نہیں اس میں سمائی مجبور غریب کسانوں کی شکلیں ہوں۔ سیلاب جا چکا تھا لیکن شاید اگلے برس کی تیاری کے لیے وقت دے گیا تھا۔۔۔۔۔ دور کہیں ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ قریب آنے پر معلوم ہوا علاقے کے منتری جی نقصان کا جائزہ لینے ہوائی سروے پر نکلے ہیں۔ ہیلی کاپٹر کے بھاری پنکھوں کی گونج پورے گاؤں میں گونج رہی تھی۔ رامو نے برجو سے کہا آج چنو ہوتا تو ہیلی کاپٹر دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑتا۔۔۔۔!

□□□

Ms. Saima Ansari
Reserch Scholar
Dept. of Urdu
Lucknow University
Lucknow-226007(U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

E-mail.:sales@ncpul.in, 011-26108159: فیکس 011-26109746: فون

دستخط

ڈاکٹر شہناز صبیح

صحرا سے نخلستان تک

(پہلا منظر)

بیٹا؛ ماں! ذرا یہ تو بتاؤ۔۔۔سب بچوں کے بابا ہوتے ہیں۔ان کو گلے لگاتے ہیں۔۔۔اپنے ساتھ ہر جگہ لے جاتے ہیں۔۔۔کیا میرے بابا نہیں ہیں؟ آپ کہتی ہیں ایک دن آئیں گے۔۔۔آخر کب؟ بتایا نہیں تھا کیا آپ کو؟؟؟

ماں: صبر کرو بیٹا! آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔۔۔انشاءاللہ!

بیٹا: وہ کس کام سے گئے۔۔۔اتنے سارے دنوں کے لیے کس نے کہاں بھیج دیا؟

ماں: تسلی رکھو بیٹا۔۔۔اللہ تعالیٰ نے اپنے کام سے بھیجا ہے۔اللہ ان کو بہت پیار کرتے ہیں اور بابا بھی ان کا کوئی حکم نہیں ٹالتے میری جان!

(دوسرا منظر)

(باہر کھٹکا ہوتا ہے)

بیٹا: کون؟ کس سے ملنا ہے؟

(شفقت سے ہاتھ بڑھا کر) ارے میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ۔۔۔ آگلے لگ جا۔۔۔پکار کر۔۔۔ہاجرہ میں آجاؤں؟)

خاتون: جی ۔۔۔جی! آڑ سے دیکھتی ہے اور پہچان کر آنے کا راستہ دیتی ہے۔(خوشی سے آنسو نکل آتے ہیں)

مرد: مجھے اللہ کی ذات سے پوری امید تھی کہ وہ تم لوگوں کو ضائع نہیں کرے گا۔۔۔

خاتون: مجھے بھی! اس بے آب و گیاہ میداں میں اسی یقین پر بیٹھی رہی۔۔۔دیکھیے کیسی سرسبزی نظر آرہی ہے نا؟

مرد: یہاں تو ریت ہی ریت تھی۔۔۔پانی کہاں سے آگیا۔۔۔میں نے پیا بڑا ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔۔۔حیرت ہے!

بیٹا: بابا۔۔۔جب میں پیاس سے رو رہا تھا، ماں اس پہاڑی پر دوڑ رہی تھی۔۔۔کبھی میرے پاس آتی کبھی پانی کی تلاش میں بھاگتی۔۔۔پر پتا ہے کیا ہوا؟ میں بتاتا ہوں میری ایڑی سے پانی کا چشمہ پھوٹا اور پانی پھیلنے لگا اماں دوڑ کر آئی اور چیخنے لگی "زم زم زم" تو پانی یہیں رک گیا۔۔۔ورنا پتہ نہیں کہاں تک بہتا۔۔۔

بابا: مسکرا کر۔۔۔ننھے میاں آپ کو کس نے بتایا یہ سب؟

بیٹا: میری ماں نے۔۔۔اور بھی بہت اچھی اچھی باتیں بتائیں۔۔

پیارے پیارے اللہ تعالیٰ کے بارے میں۔۔۔
اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گے نا۔۔۔(خوش ہوجاتا ہے)

(تیسرا منظر)

بیٹا: بابا آج آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں۔۔۔ مجھے بتائیں میں آپ کی خدمت کروں۔۔۔

بابا: میرے لال! میری جان! معلوم ہوتا ہے ابھی ہمارے امتحان کا دور ختم نہیں ہوا۔۔۔ آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔۔۔

بیٹا: وہ کیا؟ مجھے بتائیں۔۔۔ شاید میں آپ کے کام آسکوں۔۔۔

بابا: (ایک ٹھنڈی سانس بھر کے) میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے حکم دے رہے ہیں کہ اپنی سب سے پیاری چیز میرے لیے قربان کر دو۔۔۔ اور میرے لخت جگر مجھے سب سے زیادہ محبت اللہ کے بعد آپ سے ہے۔۔۔ بہت اُلجھن میں ہوں۔۔۔ آپ کی ماں بھی سن کر پریشان ہو جائیں گی۔۔۔ کیا کروں؟

بیٹا: بس اتنی سی بات۔۔۔۔ آپ شوق سے اللہ کا حکم پورا کریں۔ میرے بابا ایسے نیک ہیں۔۔۔ آپ خواب کو سچ کر دکھائیں۔۔۔ میں دل سے۔۔۔ خوشی سے تیار ہوں۔۔۔ آپ چاہیں تو اماں کو اس راز میں شریک نہ کریں۔۔۔

(چوتھا منظر)

(باپ، بیٹے جارہے ہیں)

ماں: اچھا لگ رہا ہے۔۔۔ بیٹا خوشی خوشی اپنے بابا کے ساتھ جا رہا ہے۔۔۔ خوشی سے کلانچیں بھر رہا ہے۔۔۔

(کچھ دور چل کر ایک نیک صورت سامنے آتا ہے)

نیک صورت: کہاں بچے؟ تم بھی ان بڑے میاں کے چکر میں آ گئے۔۔۔ اگر یہ سچ مچ کے بابا ہوتے تو تمہارے گلے پر چھری پھیرنے کو نہ لے جاتے۔۔۔ اور خواب ہی تو دیکھا۔۔۔ کہہ دیتے۔۔۔ منع کر دیتے۔۔۔

ماں دروازے پر بے چینی سے انتظار کر رہی ہے۔۔۔ چل میں تجھے چھوڑ آؤں۔۔۔ پچھتائے گا۔۔۔ ماں کا سوچ۔۔۔ کس مشقت سے پال، پوس کر اتنا بڑا کیا۔۔۔ مان جا۔۔۔ مان جا۔۔۔ تیرے بھلے کو۔۔۔

بیٹا: تو ایک دم بیکار کی بات کر رہا ہے۔۔۔ بابا کے خلاف۔۔۔ اللہ کے خلاف بہکا رہا ہے۔۔۔ چل بھاگ۔۔۔
بڑی محبت جتا رہا ہے۔۔۔ دور بھاگ۔۔۔!

(کچھ دور جا کر)

نیک صورت: دیکھ سن لے میری بات۔۔۔ ماں بہت روئے گی تجھے۔۔۔

بیٹا: ارے بڑا بُرا ہے تو۔۔۔ دور ہوجا ورنہ وہ بڑا سا پتھر۔۔۔ (وہ غائب ہوجاتا ہے)

(جائے وقوع سے ذرا پہلے پھر نمودار ہوتا ہے)

انتہائی نیک صورت: (محبت بھرے لہجے میں) دیکھ مارے محبت کے رہا نہیں جارہا۔۔۔ کلیجہ منہ کو آرہا۔۔۔ یہ بڑے میاں دل نہیں پتھر رکھتے ہیں جو ایسے معصوم بچے کو۔۔۔۔

بیٹا: (انتہائی غصہ سے) بڑا ضدی ہے۔۔۔ جاتا ہے کہ۔۔۔
(غائب ہوجاتا ہے)

(پانچواں منظر)

(بیٹا خوشی سے نہال ہے۔ بابا سنجیدہ ہے۔ ایک پتھر پر چھری تیز کر رہا ہے)

بیٹا: بابا آپ خوش نہیں معلوم ہوتے۔۔۔ آپ نا مجھے اُلٹا لیٹا دیں کہ میرے چہرے پر نظر نہ پڑے۔۔۔ آپ کو میری محبت اپنے فرض سے نہ روک دے۔۔۔ انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔۔۔ ایسا کریں آپ
اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیں۔۔۔ لائیے میں باندھ دوں۔۔۔
اور بس اب میں لیٹ جاتا ہوں۔۔۔
آپ اپنے خواب کو سچ کر دکھائیں۔۔۔!!!

بابا: دل مضبوط کر کے چھری پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ذبح ہوتے مینڈھے کی آواز سے آنکھوں کی کی پٹی ہٹاتے ہیں (حیرت سے) ایں یہ کیا ہوا؟ اللہ ناراض ہوگیا؟ میری قربانی قبول نہیں ہوئی۔۔۔

(ہاتھ ملتے ہوئے) (غیبی آواز)

''میرے بندے! تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا! میں تجھ سے راضی ہوا۔ اب قیامت تک لوگ اس کی یادگار کے طور ہر اس دن اپنی اولاد کے بدلے جانوروں کی قربانی کرتے رہیں گے۔۔۔''

بیٹا: (خوشی سے) دیکھا نا بابا اللہ ہم سے خوش۔۔۔ ہم اللہ سے خوش۔۔۔ اب گھر چل کر ماں کو سب بتائیں گے۔

(چھٹا منظر)

(شور۔۔ چاند ہوگیا۔۔ چاند ہوگیا۔۔۔ ذی الحجہ کا چاند ہوگیا۔۔)

ضمیر: میرے یہاں تو سب سے تگڑا۔ اونچا بکرا آئے گا۔۔۔

پچیس ہزار سے کم کا نہ ہوگا۔۔۔

ندیم: ارے جاؤ۔۔۔منھ دھور کھو ۔۔۔ابا بچن بھائی سے پچاس ہزار کے بکرے کی بات کر رہے تھے۔۔۔

وہ دیکھو شمیم آ رہا ہے۔۔۔کنجوس اس کے یہاں چھوٹا سا دس ہزاری آجائے تو بڑی بات ہے۔۔۔ہاہاہا

شمیم: (اداس ہو کر) نہیں دوستو! کووڈ کی وجہ سے ابا کا کاروبار چلا نہیں وہ تو حصہ لیں گے۔۔۔

کریم: (ہنسی روکتے ہوئے) لو بھئی ہوگئی چھٹی۔۔۔حصہ وہ بھی سستا والا ہے نا؟

شمیم: ابا کہتے ہیں اللہ تعالیٰ قربانی کرنے والے کی نیت دیکھتے ہیں۔۔۔اس کے پاس گوشت نہیں پہنچتا خلوص سے کی ہوئی قربانی کا ثواب ملتا ہے۔۔۔

ندیم: اچھا خیر چھوڑو یہ سب ۔۔۔تمھاری دعوت ہم سب کے گھر ایک ایک وقت رہے گی۔۔۔کلیجی۔پھیپھڑا، گردہ ران، بونگ، گوڑی جو پسند ہو چھک کے کھانا۔۔۔کہاں اس گرمی میں بڑے کا گوشت کھا کر پیٹ خراب کرو گے۔

شمیم: معاف کریں بھائی لوگ۔۔۔ہم لوگ تو ان لوگوں کو تلاش کریں گے جنھیں اس مہنگائی میں بڑے کا گوشت بھی نصیب نہیں۔۔۔اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دینے کا اجر دے گا۔انشاءاللہ!

سب دوست: اچھا بھئی جا جا۔۔۔اپنا وعظ کہیں اور دے۔۔۔ہمیں تو معاف کر۔۔۔ہم کل سے بکروں کی تلاش میں نکلتے ہیں۔۔۔بریانی، قورمے، دوپیازے، گلاوٹ کے کباب اور پسندوں، بھنی کلیجی کی خوشبوئیں دماغ میں بسی جا رہی ہیں۔۔۔ہم لوگ بھی اپنے رشتہ داروں میں بانٹیں گے۔۔۔۔رانوں کی باربی کیو اور جی سیخ کباب کے سوندھے، سوندھے دھنوئیں۔۔۔واہ منھ میں ابھی پانی آ رہا ہے۔۔۔

ضمیر: میں بتاؤں۔۔۔امی ایسے سارے لوگوں کے یہاں حصے بھجواتی ہیں جہاں اور زیادہ واپس آجاتا ہے۔۔۔

اگر کہیں سے بڑے کا یا خراب بوٹا آجاتا ہے، چکنائی بھرا تو اسے الگ رکھا جاتا،، پھر غریبوں کو دے دیتے ہیں وہ بیچارے اسی میں خوش ہو جاتے ہیں۔۔۔

کریم: اپنے یہاں تو بھائی مہینے بھر کا حساب ضرور ہو جاتا ہے۔۔ ارے سات سو روپے ملتا ہے۔ہفتہ میں ایک یا دو بار آتا ہے۔۔دو بوٹی سے زیادہ اپن کو نہیں ملتی۔۔۔ہم تو انتظار کرتے ہیں بقرعید کا۔۔۔کتنا اچھا تہوار ہے۔۔۔ثواب کا ثواب اور دعوتیں بے شمار۔۔۔واہ بھئی واہ۔۔۔

ندیم: اسے کہتے ہیں ''ہم خرما اور ہم ثواب''

سب دوست: ۔چلو۔۔۔چلو۔۔۔دیکھیں کیا نقشے ہیں بکر الدینوں کے۔۔۔

(سب کھلکھلاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔)

□□□

Dr. (Mrs.) Shahnaz Sabeeh
Associate Professor
Urdu department
Allahabad Degree College
Prayagraj-211003 (U.P)

شمشاد بیگم سنبل

ودائی

تا عمر نہ تم بیٹی حالات سے گھبرانا
بیٹی کا مقدر ہے بابل سے بچھڑ جانا

مالک نے تجھے بیٹی، صورت سے نوازا ہے
اس حسنِ مجسم پر سیرت کا تقاضہ ہے
کردار کی عظمت کے پرچم کو تو لہرانا
تا عمر نہ تم بیٹی حالات سے گھبرانا

ہر کام میں تو شامل شوہر کی رضا رکھنا
نظروں میں حیا پنہاں، رشتوں میں وفا رکھنا
کر دینا تکلم سے سسرال کو دیوانہ
تا عمر نہ تم بیٹی حالات سے گھبرانا

ماں باپ کی عزّت پر آنچ آئے نہیں بیٹی
دامانِ شرافت پر آنچ آئے نہیں بیٹی
آئے جو ڈگر مشکل ہنس ہنس کے گزر جانا
تا عمر نہ تم بیٹی حالات سے گھبرانا

بیٹی کو وداع کرنا بھی باعثِ رحمت ہے
سرکارِ دو عالمؐ کی مقبول یہ سنّت ہے
ماں باپ کے بھی حق میں جنت کا ہے پروانہ
تا عمر نہ تم بیٹی حالات سے گھبرانا

خوش رہ تو سدا بیٹی بابل کی دعا لے جا
گھونگھٹ میں سجا کر تو اخلاص و وفا لے جا
دیتی ہے دعاؤں کا سنبلؔ تجھے نذرانہ
تا عمر نہ تم بیٹی حالات سے گھبرانا

Mrs. Shamshad Begum Sumbul
B-4, Al-Yasin Apartment
Old Purulia Road
Zakirnagar (East), P.O.: Maango
Jamshedpur-831012 (Jharkhand)

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی

غزل

حروف ابھرے ہوئے ہیں اداس چہروں پر
ہے کس کتاب کا یہ اقتباس چہروں پر

ہوس پرستوں کو محفل سے دور رکھنے کو
نگاہ رکھتی ہوں میں آس پاس چہروں پر

عجیب قسم کا موسم ادھر سے گزرا ہے
ہر ایک سمت برستی ہے یاس چہروں پر

انھیں غموں کو چھپانے کا ہے سلیقہ جو
ہنسی سجائے ہوئے ہیں اداس چہروں پر

نہ جانے کیسی وبا آئی ہے زمانے میں
پہننا پڑتا ہے اب تو لباس چہروں پر

ولا ثمر ہے مرے دل کی کاوشوں کا یہی
سکون لاتی ہوں میں بدحواس چہروں پر

Dr. (Ms.) Wala Jamalul Usaili
Associate Prof.
Ain Shams University
Cairo, Egypt

ذکیہ شیخ مینا

غزل

بند آنکھوں میں اتر میری نظر سے پہلے
بت تخیل میں بنا لوں گی سحر سے پہلے

آتشِ عشق جگا، دہکا سا شعلہ بن جا
لو ضروری ہے بہت رقصِ شرر سے پہلے

یہ شکستہ پری پہنچائے گی تا حدِ افق
عزم ہو راسخ اگر وقتِ سفر سے پہلے

راستہ خود ہی بنالے گا یہ رفتار کا جوش
گامِ اولیٰ کا تذبذب ہے ڈگر سے پہلے

پرچمِ نور لیے تیرگیِ شب سے لڑے
ہنس کے بجھتے ہیں دیے نورِ سحر سے پہلے

بس تکبر نے ہی ابلیس کو ملعون کیا
رب کا تھا خاص وہ تکفیرِ بشر سے پہلے

مینا آدابِ محبت سے سجا روح و نظر
اپنی ہستی کو مٹا پیشِ نظر سے پہلے

Mrs. Zakiya Shaikh Meena
303, Blue Nest, Plot. No. 74
Sector No.9 Panvel
Navi Mumbai-410206 (M.S)

لذیذ پکوان

رس ملائی

ترکیب:

☆ پتیلی میں ایک کلو دودھ ڈالیں اور اسے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک چمچ چلا کر خوب پکائیں۔ پھر اس میں بازاری کریم والا دودھ، الائچی پاؤڈر اور پسے ہوئے پستے، بادام ڈال کر اچھی طرح پکائیں کہ ربڑی کی طرح دودھ بن جائے۔

☆ دوسری پتیلی میں ڈیڑھ کلو دودھ ڈالیں اور اس کو بھی اسی طرح آدھے گھنٹے تک تیز آگ پر پکائیں۔ ابال آنے پر چمچ چلائیں اور اس میں لیموں کا رس ایک ایک چمچ کر کے ڈالتی جائیں اور چمچ مستقل چلاتی جائیں۔ لیموں کا رس اس وقت تک ڈالیں جب تک کہ دودھ اچھی طرح پھٹ جائے اور کھوئے کے ٹکڑے ہو جائیں۔

☆ اس کے بعد آپ ململ کے کپڑے میں پھٹا ہوا دودھ ڈال کر اچھی طرح اس کو کس لیں کہ اس میں موجود سارا پانی نکل جائے۔

☆ جتنا زیادہ پانی نکالیں گی رس ملائی اتنی ہی نرم بنے گی۔

☆ اب کھوئے کو ایک پلیٹ پر نکالیں اور اس کو آٹے کی طرح گوندھ لیں۔

☆ اس کے بعد کھوئے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائیں اور بیچ میں تھوڑا سا زور دے کر چپٹا کر لیں۔

☆ پھر ایک بڑے پین میں دو کپ پانی ڈالیں اور اس میں تین کپ چینی ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے شیرہ پکالیں اور تمام پیڑے اس پانی میں ڈال کر ڈھکن بند کر کے پکنے دیں۔

☆ جب پیڑے اچھی طرح پک جائیں تو انھیں گاڑھے ربڑی والے دودھ میں ڈال دیں اور کچھ دیر ٹھنڈا کرنے کے بعد سرو کیجیے۔

ضروری ٹپس:

☆ اگر آپ کی رس ملائی بناتے وقت ٹوٹ جاتی ہے تو آپ دودھ میں لیموں کا رس تھوڑا تھوڑا کر کے ڈالیں اس طرح یہ ٹوٹے گی نہیں۔

☆ جب پھٹے دودھ میں سارا پانی نکال کر آپ اس کے فوراً

پیڑے بنائیں تو یہ اس وجہ سے بھی ٹوٹ جاتی ہے لہٰذا کھوئے سے پانی الگ کرنے کے بعد اس کو دس منٹ تک آٹے کی طرح گوندھیں تا کہ یہ نرم بھی ہو جائے اور اس میں ذرا سی نمی آجائے۔

☆ پیڑوں کو چینی کے شیرے میں تقریباً آدھا گھنٹہ پکائیں۔

☆ ربڑی میں پیڑے ڈالنے کے بعد اس کو دو گھنٹے فریج میں رکھ دیں تاکہ دودھ پیڑوں کے اندر تک چلا جائے۔

کھجور اور کیلے کا شیک

اجزا: کیلے:2عدد، کھجور بیج نکال دیں، ایک چوتھائی پیالی، آلمنڈ ملک 2 پیالی، تخ ملنگا بھیگا ہوا 2 چائے کے چمچے، پسی ہوئی الائچی آدھا چائے کا چمچہ، لیموں کا رس ایک کھانے کا چمچہ، برف چورہ کی ہوئی ایک پیالی، پسی ہوئی دار چینی ایک چٹکی، نمک ایک چٹکی

ترکیب: بلینڈر میں تمام اجزاء یکجان کر کے دو گلاسوں میں نکالیں' اسے دار چینی اور نمک چھڑک کر پیش کریں۔

وان ٹان

اجزا: چھوٹے اور مزیدار سموسے یعنی وان ٹان ان کو بنانا بھی آسان اور کھانے میں ذائقہ دار۔

ترکیب: ☆ چکن دھو کر اچھی طرح ابال لیں اور اس کو بلینڈر میں ڈالیں ساتھ ہی اس میں پیاز، ہری مرچ، ہلدی، دھنیا، دہی، چکن مصالحہ، شملہ مرچ، کالی مرچ، تیل اور نمک ڈال کر اچھی طرح پیس لیں۔

☆ اب وان ٹان کی پٹیاں لیں جو کہ سموسوں کی پٹیوں سے سائز میں چھوٹی ہوتی ہیں۔

☆ اب پٹیوں کے درمیان میں پسی ہوئی چکن کو رکھیں اور پٹی کے کناروں پر میدے اور پانی کا پیسٹ اچھی طرح لگا کر تکون کی شکل میں فولڈ کر لیں۔

☆ پین میں آئل گرم کر لیں اور ان وان ٹان کو ڈیپ فرائی کر لیں۔ ان کو چٹنی، رائتے اور کیچپ کے ساتھ سرو کر دیں۔

بیک میکرونی حرب سوس

اجزا: میکرونی ایک پیک، لہسن ایک کھانے کا چمچہ، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ ایک چائے کا چمچہ، شملہ مرچ ایک عدد، ٹماٹر دو عدد، میدہ تین کھانے کے چمچے، ہری پیاز دو عدد، مشروم چار عدد، بٹر 2 کھانے کے چمچے، مکس حرب ایک کھانے کا چمچہ، چکن پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ، موزریلا چیز ایک پیک، دودھ 250 ملی لیٹر

ترکیب: بوائل میکرونی پین میں ڈالیں اس کے بعد بٹر، میدہ ڈال کر بھونے پھر نمک کالی مرچ، کٹی لال مرچ، حرب ڈالیں، دودھ ڈال کر مکس کریں۔ ہری پیاز، شملہ مرچ، مشروم باریک چوپ کر کے ڈالیں۔ جس ڈش میں بیک کرنا ہے، اس میں ڈالیں۔ ٹماٹر کے رنگ کو فرائی کریں اور میکرونی پر ڈالیں۔ چیز ڈال کر بیک کر لیں۔

(بحوالہ:kfoods.com)

محمد طاہر صدیقی

قوت بخش اور لذت سے بھرپور غذا

غذا ہماری زندگی کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے پاس غذا ہے تو ہم زندہ ہیں۔ ہمیں صرف صحت بخش کھانے سے ہی توانائی ملتی ہے اور اسی توانائی کے ساتھ ہم دن بھر اپنا کام کرتے ہیں۔ ہماری جسمانی اور دماغی صحت کا انتظام غذا سے ہوتا ہے لیکن کیا صرف کھانا کھانا ہی کافی ہے؟

اگر ہم صحتمند رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں متوازن غذا کھانی چاہیے اب یہ متوازن غذا کیا ہے؟ ایک ایسی غذا جس میں تمام غذائیت متوازن مقدار میں ہوں۔ غذائی اجزاء وہ عناصر ہوتے ہیں جو کہ کھانے میں پائے جاتے ہیں یعنی ان کے استعمال سے ہی ہماری صحت اچھی رہتی ہے۔ صحتمند متوازن خوراک میں غذائی اجزاء جیسے کاربوہائیڈریٹ، پروٹین، وٹامن، معدنیات، پانی وغیرہ۔ ہمیں غذا اس طرح سے لینی چاہیے کہ ان تمام عناصر کی متوازن مقدار ہماری غذا میں شامل ہوں۔ ان میں سے چند غذائیں پیش خدمت ہیں۔

کدو: غذا بھی اور دوا بھی

یہ ایک قوت بخش اور لذت سے بھرپور غذا ہونے کے ساتھ یرقان کے علاج میں بھی اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ کدو جسے لوکی اور گھیا بھی کہتے ہیں، ایک مقبول عام ترکاری ہے۔ اس کا رنگ باہر سے سبز جبکہ اندر سے سفید ہوتا ہے۔ یہ سائز میں لمبی اور گول ہوتی ہے۔ غذائیت کے اعتبار سے اس کا شمار وٹامنز اور بشاشت و توانائی بخشنے والی بہترین سبزیوں میں ہوتا ہے۔ گوشت اور قدرے گرم مسالہ کی آمیزش سے نہ صرف اس کی تاثیر میں

خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ اس کے ذائقہ میں بھی خوشگوار تبدیلی آتی ہے۔ طب نبوی میں بھی اس کا گوشت کے ساتھ استعمال مفید بتایا گیا ہے۔ بعض نامور حکیموں کے مطابق لوکی نہ صرف غذائیت بخش ہوتی ہے بلکہ مختلف امراض میں یہ ایک موثر دوا کا کام بھی کرتی ہے۔ سر درد کے دوران تازہ کدو کا گودا کدوکش کر کے اسے پیشانی پر لیپ کریں تھوڑی دیر بعد درد جاتا رہے گا۔

دالوں کو جس طرح بے ضرر غذا تصور کیا جاتا ہے اسی طرح کدو کو سبزیوں میں بے ضرر خیال کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کا جگر کام نہیں کر رہا ہے تو

کدو کو گلا کر اس کے ٹکڑے کر لیں۔ ہفتے عشرے تک پابندی سے کھائیں بہت فائدے مند ہوگا۔ ہلکی آنچ پر پکایا ہوا کدو کا سالن ایک کثیر الغذا قدرتی ٹانک ہے۔ اس میں نہ صرف فولادی اجزا کیلشیم اور پوٹاشیم شامل ہیں بلکہ وٹامن اے اور وٹامن بی بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں ایسے معدنی اور روغنی نمکینیت وافر مقدار میں پائی جاتی ہے جو جسم میں لحمی توانائیوں میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہے۔ اسے کھانے سے معدے کی تیزابیت اور جلن وغیرہ بھی کافی حد تک دور ہو جاتی ہے۔ دائمی قبض کے مریضوں، گرم طبیعت والے افراد اور محنت کرنے والے لوگوں کے لیے کدو اور چنے کی دال کا پکوان بہترین اور قوت بخش غذا کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایسا یرقان جو لاعلاج مرض کی حیثیت اختیار کر چکا ہو اس کے لیے بہترین علاج یہ ہے کہ کدو کے 250 گرام گودے میں تین چار تولے زرشک شیریں اور آٹھ دانے آلو بخارا کو ڈال کر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر شام کے وقت اسے ملا کر اور چھان کر پلانے سے چند ہی روز میں مریض کو یرقان سے نجات مل جاتی ہے۔

کدو ہر قسم کے ورم کے لیے بھی تیر بہ ہدف نسخہ کا کام کرتا ہے۔ کدو کا ٹکڑا ورم پر رکھ کر باندھ دیں اور کدو کا تازہ پانی سونگھنے کے لیے دیں۔ ایک دو مرتبہ ایسا کرنے سے ورم جاتا رہے گا۔ اسی طرح اگر گلے میں ورم ہے تو اس کا پانی نکال کر غرارے کریں۔ اس طرح پھنسیاں معدوم ہو جاتی ہیں۔ کدو کا گودا بچھو کے ڈنک کی جگہ پر لگانے سے اور اس کا رس مریض کو پلانے سے زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ کدو کے ساتھ مغز بادام کا استعمال طاقت بخشتا ہے۔ غرض یہ کہ قدرت نے اس سبزی میں اتنی ساری خوبیاں ایک ساتھ جمع کر دی ہیں کہ انھیں مکمل تحریر کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے سبھی لوگوں کو کدو کا استعمال بکثرت کرنا چاہیے۔

گاجر صحت بخش اور افادیت سے بھرپور

گاجر ایک ایسی سبزی ہے جو پھلوں میں بھی شمار ہوتی ہے۔ گاجر عموماً پکانے، کچی کھانے اور اچار بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال سلاد میں بھی بکثرت ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی زیادہ صحت بخش اور افادیت سے بھرپور ہوتی ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق اس کا رس صحت کے لیے انتہائی مفید ہے۔ گاجر کے رس میں وٹامن 'اے' کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ جو نہ صرف پیٹ کے کیڑے ختم کرتا ہے بلکہ گاجر کھانے سے قوت بینائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ گاجر جسم میں خون بڑھاتی ہے اور چہرے کی رنگت نکھارتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کا استعمال

بعض ذہنی بیماریوں کو دور کرنے کے ساتھ دماغی پریشانی ختم کرنا اور دل کو تازگی بخشتا ہے۔

سیب بہترین دماغی غذا

سیب بہترین دماغی غذا ہے کیونکہ اس میں دوسرے پھلوں کی نسبت فاسفورس اور فولاد زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ فاسفورس دماغ کی اصلی غذا ہے۔ سیب جگر کے فعل کو درست کر کے سستی دور کرتا ہے۔ ذہنی اور دماغی قوت بخشتا ہے۔ اس کے متواتر استعمال سے خون صاف ہوتا ہے، رنگت نکھرتی ہے رخساروں میں سرخی پیدا ہوتی ہے۔ گردے اور دانتوں کے لیے بھی مفید ہے۔ سیب کا مربہ دماغ کی کمزوری کو ختم کرتا ہے۔ خون کی کمی ہونے کی صورت میں بھی سیب کا کثرت سے استعمال کرنا چاہیے۔ خواتین کو خصوصیت کے ساتھ سیب زیادہ مقدار میں کھانا چاہیے۔ تاثیر کے لحاظ سے سیب گرم تر ہے۔

یوں تو سیب کے بے شمار فوائد ہیں لیکن دل کے مریضوں کے لیے سیب قدرت کا انمول تحفہ ہے۔اس میں پوٹاشیم اور فاسفورس کی مقدار بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔لیکن سوڈیم (نمک) نہ ہونے کے برابر ہے۔دل کی بیماری میں سیب کے ساتھ خالص شہد کا استعمال زمانہ قدیم سے کیا جاتا رہا ہے۔سیب، پیشاب کے زیادہ اخراج کی وجہ سے ہائی بلڈ پریشر کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔جسم میں سوڈیم کی فراہمی سے گردوں کو آرام ملتا ہے۔اس لیے سیب کو اپنی غذا میں شامل کرنا چاہیے۔

آم غذائیت سے مالا مال پھل

آم بہت ہی لذیذ اور مفید پھل ہے۔گرمیوں کے موسم میں آم قدرت کا خاص تحفہ ہے۔لوگ تو اس کے ذائقے کے دیوانے ہیں۔اسے تمام پھلوں کا سردار مانا گیا ہے۔یہ موسم گرما کا بہترین تحفہ ہے۔اگر آپ کو بے داغ، چمکدار جلد اور تیز بینائی چاہیے تو جب تک گرمی کا موسم ہے اس

سے فائدہ اٹھائیں۔آم ایک ایسا پھل ہے،جس کے بے شمار فوائد ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔جیسے آم جسم میں کولیسٹرول کو قابو میں رکھتا ہے،آنکھوں کو تراوٹ بخشتا ہے،نظر کو تیز کرتا ہے،خون میں انسولین کی مقدار کو متوازن کرتا ہے۔اس میں وٹامن ای کی بھی خاصی مقدار موجود ہوتی ہے جو قوت باہ کو بڑھاتی ہے۔آم میں موجود وٹامن سی اور اے جسم میں قوت مدافعت کو بڑھاتے ہیں۔معدے میں بننے والی تیزابیت کو ختم کرتا ہے۔جسم میں شوگر لیول کو قابو میں رکھنے میں معاون ہے۔آم تقریباً تمام غذائی اجزا کا مرکب ہوتا ہے۔اس سے اچار، مربہ، جام، اور چٹنی بھی تیار کی جاتی ہے۔ماہرین صحت کے مطابق اس کا روزانہ استعمال جلد کو صاف، چمکدار بنانے کے ساتھ جھریوں سے بھی محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سونف خوشبودار ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی کارآمد

سونف گھریلو ضروریات میں استعمال ہونے والی کارآمد چیز ہے جو گھر کے باورچی خانہ میں موجود رہتی ہے۔اس کا پودا ایک گز لمبا ہوتا ہے، باریک نرم و نازک پتوں والے اس پودے کے اوپری حصے میں الٹی چھتری کی طرح سونف کا گچھا لگتا ہے اور یہ پھول سونف کے دانوں میں بدل جاتے ہیں۔کچی سونف کی خوشبو دور سے آتی ہے۔سونف کی دو قسم ہیں ایک بستانی اور دوسری جنگلی۔بستانی سونف اگائی جاتی ہے جبکہ دوسری خودرو ہوتی ہے۔برصغیر میں زیادہ تر بستانی سونف استعمال کی جاتی ہے۔

سونف ٹھنڈی میٹھی خوشبودار ہوتی ہے، ریاح کو خارج کرتی ہے۔سینہ، جگر، تلی اور گردہ کے سدے کھولتی ہے، کھانا ہضم کرتی ہے اور بھوک بڑھاتی ہے، معدے کی جلن کم کرتی ہے اور پیاس بجھاتی ہے۔بینائی میں اضافہ کرنے کے ساتھ پان، اچار اور سالن میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔اس طرح سے اس کے بہت سارے فوائد ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

موسم گرما کا پسندیدہ مشروب لسّی کے طبی فوائد

لسّی موسم گرما کا مرغوب مشروب ہے، جس کی مقبولیت کا اندازہ ہر خاص و عام کے درمیان اسے پینے کی جانب رغبت سے لگایا جا سکتا ہے۔لسّی ہندوستان میں خصوصی مقبولیت رکھتی ہے لیکن اب مغربی اور دیگر ممالک کے لوگ بھی اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔یہ جہاں اپنے مزا کے اعتبار سے عوام کا دل جیت لیتی ہے، تو دوسری جانب اس کے طبی فوائد بھی بہت زیادہ ہیں۔دی نیوز ٹرائب کی شائع کردہ ایک رپورٹ کے مطابق لسی پینے کے عادی افراد کو معدے کی بیماریاں لاحق نہیں ہوتیں اور شوگر کے مرض میں بھی یہ فائدہ مند ہے۔دہی اور لسّی کے استعمال سے چہرے پر شادابی اور خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔

قدرت کے عطا کردہ سبزیوں، پھلوں اور بہت سی غذا میں بے شمار فوائد ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔جن کو دوا اور غذا کی حیثیت سے بلند مقام حاصل ہیں۔ہمیں اچھی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ان سبھی چیزوں کا روزانہ غذا کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔□□□

Mohd Tahir Siddiqui
N/139-B
Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar
New Delhi -110025

حسن کی نگہداشت

کیل مہاسے کے لیے گھریلو ٹوٹکے

سب سے پہلے انڈے کی سفیدی پھینٹ لیں اور اس کو چہرے پر تقریباً 10 سے 15 منٹ کے لیے لگا کر رکھیں، پھر کسی فیس واش سے اچھی طرح منہ دھولیں۔ اس طرح جلد کے تمام کیل مہاسے ختم ہو جائیں گے۔

گرمی دانوں سے نجات کے لیے گھریلو ٹوٹکے

گرمی دانوں سے بچنے کے لیے ایک آسان اور بہترین گھریلو

ٹوٹکا جس کے استعمال کرنے سے آپ کا چہرہ ہمیشہ خوبصورت رہے گا۔ چہرے اور جسم پر ایک دانہ بھی نہیں نکلے گا۔ گرمی دانوں سے نجات کے لیے ایک عدد کھیرا لے کر اس کا رس نکال لیں اور پھر اس رس کو چہرے پر لگا دیں۔ 15 منٹ تک لگا رہنے دیں 15 منٹ کے بعد چہرہ نیم گرم پانی سے اچھی طرح کسی اینٹی بائیوٹیک صابن سے دھولیں۔ نیم کا صابن اس مقصد کے لیے بہترین ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ گرمیوں میں زیادہ سے زیادہ پانی پئیں روزانہ صبح شام نیم کے صابن سے نہائیں۔ انشاء اللہ چہرہ گرمی دانوں سے محفوظ رہے گا۔

سفید بالوں کا علاج

بالوں کو دھوپ اور خشک ہوا سے جتنا ممکن ہو بچانا چاہیے۔ آج کل بہت کم عمر لڑکے لڑکیوں کے بال سفید ہونے لگے ہیں۔ سفید بالوں کی وجہ سے چہرے کی دلکشی متاثر ہوتی ہے جن لڑکیوں کے بال کم عمری میں سفید ہوتے ہیں ان کے لیے ایک بہترین نسخہ ہے یہ۔ ایک پاؤ مہندی

میں ایک چائے کا چمچ کافی، ایک چائے کا چمچ شکر، چند قطرے لیموں اور حسب ضرورت پانی ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور جب سب چیزیں یکجان ہو جائیں تو بالوں میں لگائیں اور پھر باریک کپڑے سے سر لپیٹ لیں اور چار پانچ گھنٹے بعد سادہ پانی سے سر دھولیں، یہ عمل مہینے میں صرف ایک مرتبہ کرنا چاہیے۔ اگر آپ کے بالوں میں خشکی بھی ہو اور بال گرتے بھی ہوں تو خشکی کو دور کرنے کے لیے سرسوں کا تیل انڈہ اور دہی یہ تینوں چیزیں یکجان کر لیں اور اس آمیزے کو بالوں میں لگانے کے بعد ایک گھنٹے کے بعد سر دھولیں۔

چہرے پر دانے

دھنیے کے 20 پتوں کو پیس کر رس نکال لیں اور آدھا چمچ لیموں کا رس شامل کر کے چہرے پر 10 منٹ کے لیے لگائیں۔ پھر تازہ پانی سے دھولیں۔ 2 ہفتوں کے استعمال سے چہرے کے دانے اور بلیک ہیڈز ختم ہو جائیں گے اور آپ کا چہرہ دانوں سے پاک ہو جائے گا۔

(بحوالہ www.urdutotke.com)

تاثرات: نگر نگر سے

ماہنامہ ''خواتین دنیا'' جون2021 ویب سائٹ سے موصول ہوا۔ مدیراعلیٰ صاحب نے ''مشعل'' میں جوسوال قائم کیا ہے کہ ''ہمارے ادیب اور شاعراب کس طرح کا ادب تخلیق کریں گے'' بہت ہی اہم ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آن لائن طور پر جوسمینار، ورکشاپ اور اس قسم کی دیگر سرگرمیاں عمل میں آرہی ہیں وہ کچھ حدتک تسلی بخش ضرور ہیں۔

پورا رسالہ 9 مضامین، دوکہانیوں، حسن سخن، باورچی خانہ [لذیذ پکوان]، صحت، شاعرات کے منتخب اشعار اور حسن کی نگہداشت سے مزین ہے۔شمارے کا پہلا مضمون ''ڈاکٹرلکشمی سہگل'' [ڈاکٹرنسرین بیگم] ایک بہترین اور کارآمد تحریر ہے۔ ان کی زندگی کے مطالعہ سے خواتین کے اندر ہمت، حوصلہ اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوگا۔لکشمی سہگل نے 1940 میں اس وقت ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا جب ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو[لکھنا] سکھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے جس طرح اپنی پوری زندگی خدمت خلق اور بیماروں کی تیمارداری میں وقف کر دی وہ قابل ستائش ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد ہندوستان کو غلامی سے آزاد کرانا اور ہندوستان میں غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا تھا۔ اسی لیے جب سبھاش چندر بوس نے جولائی 1943 میں عورتوں کی پیدل فوج ''جھانسی کی رانی رجمنٹ'' بنائی تو لکشمی سہگل کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں اس کا کیپٹن بنایا گیا۔لکشمی سہگل جب میڈیکل کے آخری سال میں تھیں تو1938 میں ان کی شادی 'پی کے این راؤ' سے ہوئی کہ لکشمی سہگل کی دوسری شادی 1947 میں 'کرنل پریم کمار

سہگل، سے ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ ملک کی آزادی کے حصول میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ ڈاکٹر لکشمی سہگل جیسی مضبوط ارادوں والی خاتون کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنا ہمارا فرض ہے۔

''عدلیہ میں خواتین کی حصہ داری'' [خواجہ عبدالمنتقم] اس مضمون میں اعداد وشمار کی مدد سے دنیا میں عورتوں کی زبوں حالی کو پیش کیا گیا ہے یہ یقیناً افسوس ناک ہے۔ دنیا کی آبادی میں عورتوں کی حصہ داری تو برابر ہے مگر ان کی آمدنی کا حصہ 10 فیصد ہی ہے۔ معاشیات پر پوری طرح سے مردوں کا قبضہ ہے۔ اسی طرح عدلیہ، سپریم کورٹ کے وجود میں آنے کے تقریباً چار دہائی بعد تک کسی خاتون جج کا سپریم کورٹ میں نہ ہونا واقعی افسوس ناک ہے۔ ۲۴۷ چیف جسٹس میں محض آٹھ خاتون جج کا ہونا بھی ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اس مضمون کے اعداد وشمار کے آئینے میں ہمیں خاتون کے عدلیہ کے تناسب پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

''شکیلہ بانو بھوپالی، ایک شاعرہ'' [شمس الہدیٰ انصاری] کا مضمون فلمی ہستیوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مضمون میں شکیلہ بھوپالی کے شعری مجموعے ''ایک غزل اور'' کی تصویر کے علاوہ کہیں بھی ان کی شاعری کا نمونہ نظر نہیں آیا۔

جہان نسواں میں ناول ''آتش دان'' پر ایک عمدہ تجزیاتی مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اس ناول کا ہیرو شہباز خان اس ملک کے نوجوانوں کے لیے جہاں مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے وہیں اس کی دادی کی ہمت اور کوشش بھی یقیناً قابل ستائش ہے، جنھوں نے شہباز کو پڑھا لکھا کر اس مقام تک پہنچایا کہ وہ سیول سروسز کے امتحان میں کامیاب ہوا۔

اسی طرح راحلہ خاتون کا مضمون ''اساتذہ کی پیشہ وارانہ ترقی: چند رسمی مواقع'' بالکل منفرد نوعیت کی ایک عمدہ تخلیق ہے۔ مضمون میں کانفرنس، سمینار، سمپوزیم، ورکشاپ، اور پینٹیشن وغیرہ کی آسان لفظوں میں وضاحت اور تعریف پیش کی گئی ہے، ساتھ میں مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ ہمیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات ان سرگرمیوں سے عملی طور پر واقف ہوتے ہیں، انھیں اس میں شرکت کرنے کے مواقع بھی وقتاً فوقتاً حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن چھوٹے شہروں کے کالجوں میں زیر تعلیم اسٹوڈنٹس کو اس قسم کی سرگرمیوں میں شرکت کے مواقع شاذ ونادر ہی میسر آتے ہیں۔ لہٰذا یہ مضمون ضرور ان کی راہنمائی کرے گا۔

مجموعی طور پر ''خواتین دنیا'' کے شمارے ہر لحاظ سے ایک بہترین اور عمدہ دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں خواتین کی دلچسپی سے متعلق تمام قسم کے مواد موجود ہیں۔ حسن کی نگہداشت اور پکوان لڑکیوں کے لیے ذوق کا سامان فراہم کرتا ہے۔

ظفر الاسلام، کریم الدین پور، گھوسی مؤ، یوپی

''خواتین دنیا'' جولائی 2021 نظر نواز ہوا۔ یہ خواتین کی نمائندگی کرنے والا معیاری رسالہ ہے۔ اس میں شامل مضامین معلومات سے بھرے ہوتے ہیں۔ خاص کر شخصیت والے مضامین معلومات میں زیادہ اضافہ کرتے ہیں شخصیت میں شامل مضمون جن تخلیق کاروں پر لکھا ہوتا ہے اس میں مضمون نگار ان کی زندگی اور تخلیقات کا نچوڑ پیش کر دیتا ہے۔ ظفر الاسلام کا مضمون ''بانو طاہرہ سعید کی افسانہ نگاری'' اسی ذیل میں آتا ہے۔ یہ مضمون بہت ہی عمدہ اور معلوماتی ہے۔ ظفر الاسلام نے بانو طاہرہ سعید کی شخصیت کا پورا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں مضمون نگار نے بانو طاہرہ سعید کی شخصیت اور ادبی زندگی کو مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بڑے نقادوں یعنی محی الدین قادری اور پروفیسر سیدہ جعفر کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں جس کے سبب مضمون میں پختگی آ گئی ہے۔ مصنف کی جملہ تصانیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی ادبی خدمات کا مفصل جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو یقیناً عام قاری کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ مضمون نگار نے اپنے کثیر المطالعہ کے ذریعے بانو طاہرہ سعید کی وجیہ شخصیت کے ہر ممکن پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور انتہائی سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ اسے ترتیب دیا ہے۔ ان کی تصانیف اور افسانوں کے نمونے اقتباسات کے ذریعہ پیش کیے گئے ہیں تاکہ قاری کو بانو طاہرہ سعید کے افسانوں کو سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ بانو طاہرہ سعید نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں نظم، غزل، انشاء مضامین اور افسانے وغیرہ ہیں لیکن مختصر سے مضمون میں سبھی نثری وشعری اصناف پر گفتگو کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ مگر اس مضمون میں مضمون نگار نے عنوان کا خیال رکھتے ہوئے مختصر طور پر کچھ افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے قائم شدہ شرطوں پر کھرا اترنے کی پوری کوشش کی ہے۔ بلاشبہ یہ مضمون اردو ادب کے ذخیرے میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

ارم ناز، 4/273 اندرا نگر شکلا گنج کان پور

□□□

مکے باز لولینا کو کانسے کا تمغہ، ہندوستان کا تیسرا میڈل

ہندوستانی مکے باز لولینا بورگوہین نے چینی تاپیے کی چین نیین چن کو ایک۔ ۴/۱ سے شکست دے کر ٹوکیو اولمپک کے مکے بازی مقابلے کے سیمی فائنل میں داخلہ حاصل کرلیا اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے ملک کے لیے کم ازکم کانسے کا تمغہ یقینی کرلیا ہے۔ یہ ان کھیلوں میں ہندوستان کا دوسرا تمغہ ہے اور مکے بازی میں تیسرا تمغہ ہے۔ اس سے قبل لیجنڈ باکسر ایم سی میری کوم نے 2012 کے لندن اولمپک میں کانسے کا تمغہ اور وجیندر سنگھ نے 2008 کے بیجنگ اولمپک میں کانسے کا تمغہ جیتا تھا۔ ٹوکیو اولمپک میں اس سے قبل ویٹ لفٹر میرا بائی چانو نے تاریخی چاندی کا تمغہ جیتا تھا۔ ٹوکیو 2020 کے سیمی فائنل میں پہنچ کر کانسے کا

تمغہ یقینی کرنے والی ہندوستانی مکے باز لولینا کو فائنل میں پہنچنے کے لیے ٹاپ سیڈ یافتہ ترکی کی مکے باز بسے ناز سرمینیلی کا سامنا کرنا ہوگا۔ 23 سال کی لولینا نے اپنی جیت کے بعد نامہ نگاروں سے کہا کہ،" مقابلے کے لیے کوئی الگ سے حکمت عملی نہیں تھی، مجھے کسی کو نہیں بلکہ خود کو ثابت کرنا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنا کام کیا۔ میں بہت خوش ہوں اور میں نے مقابلے میں بغیر کسی دباؤ کے کھیلا۔ لولینا نے مزید کہا کہ مجھے ابھی یہیں نہیں رکنا ہے، مجھے آگے تک جانا ہے ۔ میرا اگلا ہدف طلائی تمغہ ہے اور اس کے لیے مجھے سیمی فائنل کی تیاری کرنی ہے۔ مجھے جو وقت ملا ہے اس میں میں بہت زیادہ محنت کرتے ہوئے طلائی تمغہ کی تیاری کرنے والی ہوں۔

(انقلاب ڈاٹ کام، 31 جولائی 2021)

پی وی سندھو بھارت کی مثالی شخصیت اور تحریک ہیں

عالمی چمپئن پی وی سندھو نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چین کی ہی بنگ جیاؤ کو 15-21، 13-21/ سے شکست دے کر بیڈمنٹن سنگلز مقابلے میں کانسے کا تمغہ جیت لیا اور اس کے ساتھ ہی سندھو نے ہندوستان کو ٹوکیو اولمپک کھیلوں میں تیسرا تمغہ دلایا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مسلسل 2/ اولمپک میں تمغہ جیتنے والی پہلی خاتون اولمپین ہونے کی تاریخ بھی رقم کردی۔ پی وی سندھو اس کے ساتھ ہی اولمپکس میں مسلسل 2/ تمغے جیتنے والی ملک کی دوسری کھلاڑی اور یہ اعزاز حاصل کرنے والی ملک کی پہلی خاتون کھلاڑی بن گئی ہیں۔ اس سے قبل یہ کارنامہ پہلوان سشیل کمار نے حاصل کیا تھا جنھوں نے 2008 بیجنگ اولمپکس میں کانسہ اور 2012 لندن اولمپکس میں چاندی کا تمغہ جیتا تھا۔ سندھو نے 2016 ریو اولمپک میں چاندی کا تمغہ اور ٹوکیو اولمپکس میں کانسے کا تمغہ جیتا۔ ہندوستان اپنے اس تیسرے تمغے کے ساتھ ریو اولمپک میں جیتے دو تمغوں سے آگے نکل گیا ہے۔ جیسے ہی سندھو نے کانسے کا تمغہ جیتا، ہندوستان کے واحد اولمپک انفرادی طلائی تمغہ جیتنے والے نشانہ باز ابھینو بندرا نے سندھو کو جیت کے لیے ٹویٹر پر مبارکباد دی۔ سندھو کو گزشتہ ریو اولمپکس کے فائنل میں اسپین کی کیرولین مارین سے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انھوں نے کانسے کے تمغے کے لیے لگاتار گیمز میں چین کے بنگ کو شکست دی۔

(انقلاب ڈاٹ کام، 2 اگست 2021)

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو شاعری میں قومیت کا تصور

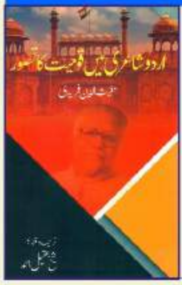

مصنف: مغیث الدین فریدی

ترتیب و تقدیم: شیخ عقیل احمد

سنہ اشاعت: 2021

صفحات: 234، قیمت 135 روپے

مسلم حکومت کے دوران ہندوستان میں علم کا فروغ

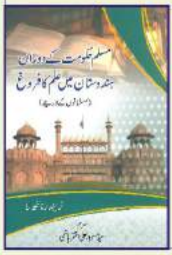

مصنف: نریندر ناتھ لا

مترجم: سید مسرور علی اختر ہاشمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 177، قیمت: 110 روپے

اردو کیسے لکھیں؟

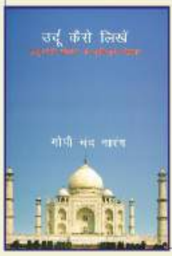

مصنف: گوپی چند نارنگ

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 104

قیمت: 58 روپے

پریم چند

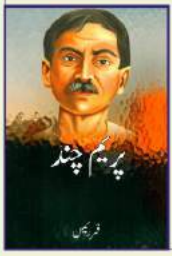

مصنف: قمر رئیس

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 53

قیمت: 40 روپے

اردو صحافت (1858 سے 1900 تک کا ایک مختصر جائزہ)

مصنف: فاروق ارگلی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 191

قیمت: 110 روپے

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت

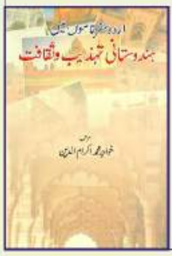

مرتب: خواجہ محمد اکرام الدین

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 504

قیمت: 235 روپے

مبادیات صحافت و ادارت

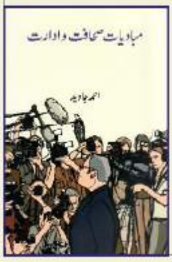

مصنف: احمد جاوید

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 128

قیمت: 45 روپے

انوکھے شکاری

مصنف: شمس الاسلام فاروقی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, सितम्बर-२०२१ वर्ष: ५, अंक: ०९
Mahnama Khawateen Duniya Monthly September 2021, Vol. 5, Issue:9
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-09-2021
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6